

سیرت نگاری  
آثار امامت

نگار سجاد ظہیر





يَلُوحُ الْخَطُّ فِي الْقِرطَاسِ دَهْرًا  
وَكَاتِبُهُ رَمِيمٌ فِي التَّرَابِ  
(تحریر کاغذ (قرطاس) میں عرصہ تک چمکتی رہتی ہے  
جب کہ اسے لکھنے والا مر کر مٹی میں بوسیدہ ہو جاتا ہے)

---

سیرت نگاری — آغاز و ارتقاء



تالیف

نگار سجاد ظہیر

قرطاس

---

قرطاس

سلسلہ مطبوعات - ۷۴

بار اول ۱۴۱۳ھ / ۲۰۱۰ء

135000

قیمت مجلد: ۲۵۰ روپے

غیر مجلد: ۲۲۰ روپے

موبائل: 0331-2745439

کمپوزنگ: خرم سبز واری

ISBN:

978-969-8448-85-1

زیر اہتمام:

قرطاس

پوسٹ بکس نمبر 8453

کراچی یونیورسٹی - کراچی 75270

فون # 0300-9245853

ای میل: nigarszaheer@yahoo.com

ویب سائٹ: www.qirtas.co.nr

---

انتساب

عشقِ رسول کے اس جذبے کے نام  
جس نے یہ رُباعی کہلوائی

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر  
روز محشر عذر ہائے من پذیر  
در حسابم را تو بنی ناگزیر  
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

(علامہ اقبال)

---

## محتویات

صفحہ نمبر

۱۱

ابتدائیہ

۱۷

باب اول: سیرت معنی و مفہوم

۲۵

سیرت اور حدیث

۲۹

سیرت اور تاریخ

۳۳

باب دوم: متقدمین سیرت نگاروں کے بنیادی ماخذ

۳۳

فصل اول: قرآن کریم

۳۶

عربی زبان کی خصوصیات

۴۰

تدوین قرآن

۴۵

قرآن بطور ماخذ تاریخ

۵۰

قرآن بطور ماخذ سیرت

۵۷

فصل دوم: حدیث

۵۷

معنی و مفہوم

۵۸

ضرورت و اہمیت

۵۹

تدوین حدیث

۷۹

باب سوم: سیرت نگاری کا آغاز (دور اول)

۷۹

فصل اول: دبستان اول، مدینہ منورہ

۸۰

سیرت و مغازی، تدوین سے قبل

۸۹	فصل دوم: سیرت و مغازی پر اولین کتب کی تدوین
۹۰	حضرت عروہ بن زبیر اور ان کی کتاب المغازی
۹۵	حضرت ابان بن عثمان اور ان کی کتاب المغازی
۹۹	حضرت ابن شہاب زہری اور ان کی کتاب المغازی
۱۱۳	فصل سوم: دور اول کے دیگر راویان اور مصنفین سیرت
۱۱۴	سعید بن سعد بن عبادہ
۱۱۵	سہل بن ابی حمزہ
۱۱۵	سعید ابن مسیب
۱۱۷	عبداللہ ابن کعب
۱۱۸	قاسم بن محمد
۱۱۹	عاصم بن عمر بن قتادہ
۱۲۰	جعفر بن محمود انصاری
۱۲۱	شرحبیل بن سعد
۱۲۲	یعقوب بن عتبہ
۱۲۲	عبداللہ بن ابی بکر
۱۲۳	یزید بن رومان
۱۲۴	ابوالاسود
۱۲۵	داود بن الحسین
۱۲۵	موسیٰ بن عقبہ
۱۳۲	باب چہارم: دیگر شہروں میں سیرت نگاری کا آغاز
۱۳۳	کوفہ

۱۳۷	عامر بن شراحیل شعبی
۱۳۹	عمرو بن عبداللہ السبعی
۱۳۹	بصرہ
۱۴۲	ابوالمعمر سلیمان بن طرخان تیمی
۱۴۳	یمن
۱۴۴	وہب بن مدبہ صنعانی
۱۵۴	باب پنجم: سیرت نگاروی کا ارتقاء (دورِ ثانی)
۱۵۵	نیا دارالخلافہ بغداد
۱۵۸	فصل اول: دورِ ثانی کے تین نمائندہ سیرت نگار
۱۵۸	(۱) محمد ابن اسحاق
۱۵۸	حالات زندگی
۱۶۳	ابن اسحاق کے بارے میں علماء کی رائے
۱۶۶	ابن اسحاق کی سیرت نگاری
۱۶۹	ابن اسحاق کے ماخذ
۱۷۱	ابن اسحاق کا اسلوب
۱۷۴	راویان سیرۃ ابن اسحاق
۱۷۶	آثار علمیہ
۱۸۳	فصل دوم: (۲) محمد بن عمر الواقدی
۱۸۳	حالات زندگی
۱۸۷	حکمرانوں کے ساتھ تعلقات
۱۸۹	واقدی کے بارے میں اقوال علماء



۱۹۲	واقدی کی کتاب المغازی
۱۹۹	آثار علمیہ
۲۰۶	فصل سوئم: ۳) محمد ابن سعد
۲۰۶	حالات زندگی
۲۰۷	ابن سعد کے بارے میں علماء کی رائے
۲۰۸	ابن سعد بطور سیرت نگار
۲۱۸	باب ششم: دور ثانی کے دیگر سیرت نگار
۲۱۸	معمر بن راشد
۲۲۰	عبدالرحمن بن عبدالعزیز حنفی
۲۲۰	ابومعشر سندی
۲۲۳	سلیمان بن بلال تیمی
۲۲۳	عبدالملک بن محمد بن ابوبکر انصاری
۲۲۵	علی بن مجاہد کابلی
۲۲۶	زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی
۲۲۷	ابراہیم بن سعد بن ابراہیم
۲۲۸	ہشیم بن بشیر واسطی
۲۲۸	ابو اسحاق ابراہیم بن محمد فزاری
۲۲۹	سلمہ بن الفضل ابرش
۲۳۰	محمد بن سلمہ باہلی حرانی
۲۳۰	یحییٰ بن سعید اموی
۲۳۱	ابوالعباس اموی

۲۳۲	ولید بن مسلم قرشی دمشقی
۲۳۲	عبداللہ بن وہب
۲۳۳	یونس بن بکیر
۲۳۳	ابو حذیفہ
۲۳۵	عبدالرزاق بن ہمام
۲۳۶	عبدالملک بن ہشام حمیری
۲۳۹	علی بن محمد مدائنی
۲۴۱	ابن عائد
۲۴۲	محمد بن عبداللہ بن نمیر کوفی
۲۴۲	عبدالملک بن حبیب سلمی
۲۴۳	حسن بن عثمان زیادی
۲۴۴	احمد بن حارث خزاز
۲۴۵	حماد بن اسحاق
۲۴۵	ابو ذرعہ
۲۴۵	اسماعیل بن اسحاق
۲۴۶	ابراہیم بن محمد بن سعید
۲۴۶	ابراہیم بن اسحاق
۲۴۷	محمد یحییٰ مروزی
۲۴۸	خلاصہ بحث:
۲۵۹	ضمیمہ سیرت نگاران نبوی
۲۶۶	کتابیات

## ابتدائیہ

سیرت دراصل تاریخ ہی کا ایک معتبر جزو ہے، جب مسلمانوں نے تاریخ نویسی کی طرف توجہ دی تو پہلے پہل رسول اللہ کی سیرت و مغازی ہی پر مواد اکٹھا کیا گیا۔ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب کے صحراوں، نخلستانوں اور قصبہ نما شہروں میں رہنے والے قبائل عرب لکھنے پڑھنے سے اتنا علاقہ نہیں رکھتے تھے، البلاذری کے بیان کے مطابق مکہ میں کل سترہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے، گوکہ یہ فہرست حتمی نہیں اور اس میں مزید پانچ چھ ناموں کا اضافہ ہو چکا ہے، تاہم اس صورت میں بھی یہ کوئی قابل اطمینان صورت حال نہیں تھی، مدینہ کا حال ہو سکتا ہے اس سے بہتر رہا ہو کیونکہ وہاں یہودی علماء کی موجودگی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ علمی سرمایہ موجود رہا ہوگا۔ عرب بنیادی طور پر اصحاب سیف تھے، اصحاب قلم نہیں، کتاب و قلم سے ان کا رشتہ قرآن نے جوڑا ہے۔

قرآن جس نے علم کو فوق الکل اہمیت دی اور اپنے ماننے والوں کو بتایا کہ اسلام عین علم ہے اور جہالت کفر ہے، قرآن اپنے پیروکاروں کو بار بار غور فکر، تدبر و تفکر اور حصول علم کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں کثرت سے امم سابقہ کا تذکرہ ہے جس سے مسلمانوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس دلچسپی کے پیش نظر جب مسلمانوں نے تاریخ کی طرف توجہ دی تو رسول اللہ کی سیرت کی تالیف کی راہیں استوار ہوئیں صرف تاریخ و سیرت ہی نہیں علوم و فنون کی جملہ شاخوں کی طرف مسلمانوں نے توجہ دی جس کی وجہ سے وہ علمی تحریک اٹھی جس کی نظیر مشرق و مغرب میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی،

مسلمانوں کی فتوحات ملکی کی طرح فتوحات علمی کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔  
 ایسی علمی تحریک کی مثال نہ یہودیت پیش کر سکی ہے نہ عیسائیت، نہ ایران پیش  
 کر سکا ہے نہ ہندوستان۔ ان سارے مذاہب اور ساری تہذیبوں میں علم پر مذہبی طبقوں  
 کی اجارہ داری قائم رہی ہے۔ یہودی بہت عالم و فاضل مانے جاتے تھے۔ جزیرۃ العرب  
 میں جب اسلام آیا تو عموماً یہودی ہی تھے جو پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے اور ان کے پاس  
 کتاب مقدس (توراة) کا علم تھا۔ لیکن یہ علم ان کے ربیوں تک محدود تھا، عام عوام کو  
 کتاب مقدس کے مندرجات سے لاعلم رکھا جاتا تھا۔ ان کے اس کتمان آیات اور تلبیس  
 حق کی قلعی قران نے کھولی ہے۔ یہی حال عیسائیت کا تھا، انا جیل کا علم پادریوں کے  
 پاس تھا، عام عوام اس سے نا بلد تھی۔ پادریوں نے اپنی دکان چکانے کے لیے عوام کا بائبل  
 سے رشتہ کاٹ دیا۔ دنیا میں جو جی چاہیے وہ کریں، ان کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ  
 پادری کے پاس آکر ”اعتراف گناہ“ کر کے پاک ہو جائیں، ایسے میں عوام کو کیا مطلب  
 کہ ان کی کتاب مقدس میں کیا لکھا ہے اور کیوں لکھا ہے؟

ہندوؤں کے یہاں صورت حال اس سے بھی زیادہ بدتر ہے وہاں ویدوں کا علم  
 صرف برہمن حاصل کر سکتا ہے یا کھتری۔ دیگر ذاتوں کو مذہبی علم سے کوئی مطلب نہیں، ان  
 کا کام صرف برہمن کو خوش رکھنا ہے جو دیوتا کا اوتار ہے، بلکہ وہاں شودروں کے لیے تو  
 اس صورت میں بھی بھیا تک سزائیں ہیں کہ اگر اس کے کان میں ویدوں کے منتر  
 پڑ جائیں تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔

ایرانی جو اپنے سیاسی استحکامات اور تہذیبی ترقی پر ہمیشہ احساس برتری کا شکار  
 رہے، ان کا حال یہ تھا کہ امراء کا طبقہ یا مذہبی طبقہ علمی طور پر اجارہ دار بنا ہوا تھا، عوام یا  
 غلاموں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ۱۵ھ میں جب جنگ قادسیہ ہوئی اس کے نتیجے میں  
 ایرانیوں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ عرب تو اپنے غلاموں اپنی عورتوں اور لونڈیوں کو بھی

علم سکھاتے ہیں تو ان کا ایک سپہ سالار (رستم) بلبلا گیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

اَكَلِ عَمْرُ كَبْدِي، يُكَلِّمُ الْكَلَابَ، فَيُعَلِّمُ الْعَقْلَ

یعنی عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا، یہ کتوں کو تعلیم دیتا ہے اور ان کو عقل سکھاتا ہے۔

اور تو اور امریکہ کی ریاست جنوبی کیرولینا میں ۱۸۳۳ء تک یہ حال تھا کہ ان کا یہ قانون تھا کہ غلاموں خصوصاً حبشیوں کو تعلیم دینے یا اس سلسلہ میں تعاون کرنے والے کے لیے سزا تھی، سفید فام ہونے کی صورت میں سو ڈالر اور سیاہ فام ہونے کی صورت میں پچاس ڈالر اور پچاس کوڑوں کی سزا۔

اس کے مقابلے میں اسلام کا رویہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہر ماننے والے مردوزن، بوڑھے، جوان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ اور صرف علم حاصل ہی نہ کرے بلکہ اس پر عمل بھی کرے اور اس کی اشاعت بھی کرے۔ قرآن کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر علوم کی طرف بھی قرآن نے توجہ دلائی ہے، جن کا حاصل کرنا فرض کفایہ کے زمرے میں رکھا گیا، اس قرآنی رویے کی وجہ سے علوم دینیہ کے علاوہ طب، فلکیات، ریاضی، نباتات، علم الادویہ، ادب، تاریخ غرضکہ کون سا گوشہ تھا جو مسلمانوں کی علمی فتوحات سے خالی رہ گیا ہو۔ اسی کے نتیجے میں وہ علمی تحریک چلی جس نے صدیوں مسلمانوں کو علم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنائے رکھا اور جس کی نظیر کوئی تہذیب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

وہ علوم جن پر پہلی صدی ہجری میں ہی کام شروع ہو گیا تھا ان میں ایک سیرومغازی کا علم بھی ہے، اس کی ابتدائی کتابیں (جنہیں فنی اعتبار سے کتب سیرت نہ بھی کہا جاسکے) پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں مدون ہو چکی تھیں، اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں کہ ابھی بنو امیہ برسر اقتدار تھے، فنی اعتبار سے سیرت کہی جانے والی کتب، تالیف ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

شائد یہ عشق رسول کا کرشمہ تھا کہ یہ علم بڑی تیزی سے پھیلا۔ اور اس نے ارتقاء کی منازل بھی بڑی برق رفتاری سے طے کیں اور تیسری صدی ہجری گزری ہی تھی کہ اس فن میں متقدمین کی مستند، معتبر اور معیاری تالیفات منظر عام پر آچکی تھیں۔ متقدمین کی ان کتابوں میں سے بہت کچھ ضائع بھی ہو گیا، لیکن بہت کچھ امتداد زمانہ سے محفوظ بھی رہا۔ متقدمین سیرت نگاروں کا بہت بڑا سرمایہ، نقل ہو کر متاخرین کے یہاں محفوظ ہو گیا۔

سیرت نگاری کا یہ سلسلہ حضرت عروہ بن زبیر یا ابان بن عثمان سے شروع ہو کر بلارکے آج تک جاری ہے، اس موضوع پر ہر زبان میں، ہر ملک میں، اور ہر عہد میں کتابیں لکھی گئی ہیں، تاہم ان سب کا احاطہ زیر نظر کتاب کے موضوع سے باہر ہے۔ اس کتاب میں صدر اول یعنی تابعین و تبع تابعین تک کے دور میں ہونے والی سیرت نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے، اسے متقدمین کا دور بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ تیسری صدی ہجری تک محدود ہے۔

جس طرح سے حدیث کی تحفیظ و ترویج کے لیے کی جانے والی متقدمین علمائے محدثین کی کاوشوں پر مسلمان جتنا فخر کریں کم ہے، اسی طرح رسول اللہ کی سیرت کے جملہ پہلوؤں کو محفوظ کرنے والے سیرت نگاران نبوی کی کاوشوں کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔ حدیث کی تحفیظ کے لیے علماء اور محدثین نے بے مثال جدوجہد کی، اسی سے علمی اسفار کی روایت مستحکم ہوئی۔ اسی سے لاکھوں راویان حدیث کے حالات قلمبند ہوئے، علم جرح و تعدیل اور رجال کا فن ایجاد ہوا۔ محدثین و مورخین اسلام کی اسی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے جرمن مستشرق اسپرنگر نے، جو مغربی مستشرقین میں سیرت پر اپنی تصنیف کی وجہ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے ”الاصابہ فی تمیز الصحابہ“ کو ایڈٹ کرتے ہوئے ۱۸۸۶ء کی طباعت میں اپنے معروف مقدمے میں کہتا ہے کہ ”کوئی قوم دنیا میں

ایسی گذری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

حدیث ہی کی طرح علماء نے سیرت کی تحفیظ کی ضرورت بھی محسوس کی کیونکہ قرآن نے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

”اور رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روکیں، اس

سے رک جاؤ“ (سورۃ حشر، آیت ۷)

”بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے“

(الاحزاب۔ آیت ۲۱)

”اگر تمہارے آپس میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو حوالہ کر دیا کرو اس

امر کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف“ (النساء۔ ۵۹)

نیز اس طرح کا حکم کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی، تو متعدد جگہ دہرایا گیا ہے۔ ان احکامات کی روشنی میں مطالعہ سیرت اور پھر اس پر عمل عین دین کا تقاضا ہے، اسی وجہ سے علماء نے رسول اللہ کی زندگی کے ہر پہلو کو محفوظ کرنا ضروری سمجھا، یہ معلومات حدیث اور سیرت کی صورت میں جمع ہوئیں۔

آج بھی رسول اللہ کی سیرت کے مطالعہ اور اس پر عمل کی ضرورت ہے، کہ ان کا راستہ خیر کا راستہ، ان کا پیغام امن و سلامتی کی ضمانت، اور ان کی سیرت ایک نبی اور ایک مثالی انسان کی سیرت ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ بیان کتنا درست ہے ”آج مذاہب کی تاریخ میں کتنے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہمارے اوتار، ہمارے پیغمبر، ہمارے بھگوان کی زندگی کا ایک لمحہ محفوظ ہے، اگر وہ یہ دعویٰ کریں گے بھی تو اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی، کتابیں بتاتی ہیں کہ بعض اہل مذہب تو اپنی کتابیں بھی محفوظ نہ رکھ سکے، لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنا سرمایہ مذہب محفوظ رکھا۔ فللہ الحمد علیٰ

ذالک (النبی الخاتم، ص ۷)

اعتقادی نقطہ نظر سے بھی سیرت کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے اسلام کا اپنے بندوں سے توحید کے بعد رسالت پر ایمان لانے کا تقاضا ہے، رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لائے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ جو ذات عقائد و ایمانیات کے حوالے سے اتنی اہم ہو اس کی سیرت سے غفلت بدترین جرم ہے لہذا علماء نے سیرت پر ہر دور میں لکھا اور بڑی محنت سے لکھا۔ اس کتاب میں انہیں سیرت نگاروں کی کاوشوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا، تاہم زیر نظر کتاب اس موضوع کی پہلی کتاب نہیں، اور یقیناً آخری بھی نہیں۔ یہ محض ابتدائی تین صدیوں یا صدراول کے سیرت نگاروں کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس حوالے سے ابھی بہت کام کیا جاسکتا ہے۔

۷

نگار سجاد ظہیر

(پروفیسر شعبہ اسلامی تاریخ)

جامعہ کراچی۔ کراچی)



## سیرت: معنی و مفہوم

مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا آغاز مغازی اور سیر سے ہوا۔ مغازی کی روایت اور درس کی ابتداء عہد خلافت راشدہ میں ہو چکی تھی اور پہلی صدی ہجری ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ مغازی و سیرت کی ابتدائی کتابیں مدون ہو چکی تھیں۔

قبل از اسلام عربوں میں تاریخ نگاری کا کوئی چلن نہیں تھا تاہم یمنی عربوں کے پاس تاریخ نگاری کی روایت ضرور تھی اور ان کے پاس کچھ تاریخی تحریری سرمایہ بھی تھا۔ پھر عربوں کی حماسی شاعری، ایام العرب کے منظوم تذکرے، اور علم الانساب کی وجہ سے ان کے پاس ایک تاریخی سرمایہ جمع ہو گیا تھا جس نے آگے چل کر تاریخ نگاری کی روایت قائم کرنے میں عربوں کی مدد کی۔ ماضی کی شاندار روایات کو یاد رکھنا اور آبا و اجداد کے محاسن و مفاخر کو بیان کرنا قدیم زمانے سے دنیا کی قوموں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ عرب جاہلیہ کے یہاں بھی اس کا خاص اہتمام تھا وہ اپنے قصائد و اشعار اور قصص و انساب کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو آبائی اور قبائلی روایات سے آگاہ کرتے تھے، ان کے یہاں جو دوستانہ، ایفائے عہد، مہمان نوازی، قبائلی حمیت، حق جواز جیسے امور بہترین اوصاف شمار کیے جاتے تھے اور باہمی جنگ و جدل، قومی ایام و وقائع، احساب و انساب کی داستانیں بڑے فخر سے سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ عربوں میں نوشت و خواند کا رواج بہت کم تھا، اپنے خداداد حافظہ کی وجہ سے وہ بڑی حد تک اس سے مستغنی تھے۔ اس لیے قبائلی اور

قومی مفاخر و محاسن کو آنے والوں تک زبانی طور پر پہنچاتے تھے، اس کے لیے خاص اہتمام کرتے تھے۔ باہمی مفاخرہ کی مجالس بپاکی جاتی تھیں، مشاعرے منعقد ہوتے تھے چاندنی راتوں میں کھلی جگہ پر جمع ہو کر اپنے قبائل کے بہادرانہ کارنامے سنائے جاتے تھے۔ یمن اور شام سے متصل قبائل اپنے بادشاہوں کے واقعات بھی بیان کرتے تھے۔ عربوں کی تاریخ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی تین اداروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ منافرہ

۲۔ ایام

۳۔ انساب

عربوں میں منافرہ کے نام سے ایک ادارہ موجود تھا۔ جب دو عرب قبائل میں اختلاف ہو جاتا کہ کون سا قبیلہ افضل ہے؟ یا کسی قبیلے کی سرداری کے دو یا زائد داعویدار میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ اس کا فیصلہ سربراہ منافرہ کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ سربراہ منافرہ اس موقع پر یہ دیکھتا تھا کہ کس کے آباء و اجداد کی خدمات زیادہ ہیں؟ کس موقع پر کس خاندان کا کردار زیادہ اہم تھا؟ گویا سربراہ منافرہ کے پاس قبائل کے حوالے سے وسیع معلومات ہوتی تھیں۔ منافرہ کا یہ ادارہ بنو عدی کے پاس تھا۔ جب جناب عبد مناف کا انتقال ہوا اور ان کی جانشینی پر ان کے دو بیٹوں ہاشم اور عبد شمس میں اختلاف ہوا تو حضرت عمر فاروق کے دادا کو حکم بنایا گیا تھا کیونکہ منافرہ کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ انہوں نے تفصیل سے فریقین کا موقف سنا اور جناب ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

دوسرا ادارہ 'ایام العرب' کا تھا۔ عربوں میں قدیم قبائل کے کارنامے اور خصوصاً جنگوں میں فتوحات کے تذکرے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے۔ ایام العرب کا موضوع صرف جنگیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ اور بھی بہت سے معرکے تھے جن کی وجہ سے کوئی

قبیلہ باعزت یا زیادہ کامیاب قرار پاتا تھا۔ یہ معلومات عربوں میں جمع ہوتی تھیں اور نسلًا بعد نسلًا منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ لہذا یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ عربوں میں کسی حد تک تاریخ سے شغف موجود تھا۔

پھر ان دونوں اداروں سے بڑھ کر ”علم انساب“ کے بارے میں عربوں میں اہتمام موجود تھا۔ عرب غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انساب کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ انسانوں کے علاوہ وہ اپنے گھوڑوں اور مویشیوں تک کے انساب بھی یاد رکھتے تھے۔ اس طرح سے تقریباً ہر قبیلہ اور خاندان کے بارے میں ان کے پاس معلومات کا ذخیرہ تھا۔

جب نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا جس میں متعدد مقامات پر اہم سابقہ اور انبیاء کے قصص و واقعات بیان کئے گئے ہیں تو مسلمانوں میں فطری طور پر تاریخ سے دلچسپی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآن کی تفسیر نے ایک زبردست تاریخی سرمایہ بھی فراہم کر دیا تھا لہذا عربوں نے تاریخ نویسی شروع کر دی۔ ابتداً مدینہ منورہ میں قرآن کے علاوہ جو چیزیں ضبط تحریر میں لائی گئیں وہ یا حدیث تھی یا مغازی و سیرۃ۔

تاریخ نویسی میں مغازی و سیرت کی طرف عربوں کے رجحان کی وجہ بڑی فطری تھی، رسول اللہ سے محبت و عقیدت نے جہاں انہیں آپ کے اقوال، افعال، شمائل اور زندگی کے دیگر معاملات کو محفوظ کرنے کی طرف متوجہ کیا، وہیں بیشتر عرب چونکہ قبائلی طرز زندگی کے عادی تھے، اور قبائلی نظام میں جنگی معرکوں اور مہمات پر بڑا زور ہوتا ہے۔ لڑائیوں اور جنگوں کے حالات و واقعات کو محفوظ رکھنا اور وقت ضرورت ان کو بیان کرنا اپنے اجداد کا تذکرہ، اور اپنے قبیلے کے اوصاف و فخر کے ساتھ بیان کرنا، قبائلی زندگی کا لازمہ ہے، انہی وجوہات کی بناء پر جب عربوں نے تاریخ کی طرف توجہ کی تو سب سے پہلے غزوات اور جنگوں کی تفصیلات ضبط تحریر میں لائی گئیں اور انہیں مغازی و سیر کا

نام دیا گیا۔

’سیرة‘ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کی جمع ’سیر‘ ہے۔ یہ لفظ سار، لیسر، سیرا و سیرا سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں چلنا پھرنا۔ سیرة کا لفظ مسافت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ’السیارة‘ کے معنی قافلہ کے ہیں۔ السیرة کے معنی ہیئت، حالت یا شکل و صورت کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں سورہ طہ آیت ۲۱ میں آیا ہے۔ تاج العروس کے مطابق سیرة کے معنی طریقہ کے بھی ہیں۔ احسن السیر کا مطلب ہے ’اچھا طریقہ‘۔<sup>۴</sup> الغرض ’سیرت‘ کے لغوی معنی چال چلن، طور طریقہ اور روش کے ہیں۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے حالات زندگی اور اخلاق و عادات کا بیان ہے۔ تاہم یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ لفظ ’سیرت‘ محدثین، فقہاء اور مورخین کے یہاں قدرے فرق کے ساتھ مروج ہے۔ سیرة کا لفظ فقہاء اور محدثین کے یہاں محدود جبکہ مورخین کے یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فقہاء کے نزدیک ’سیرت‘ کا وہ وسیع مفہوم نہیں ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ جہاد اور غزوات میں رسول اللہ ﷺ نے کفار و مشرکین کے ساتھ جو معاملہ فرمایا ہے فقہاء اس کو سیرت سے تعبیر کرتے ہیں جس کی جمع سیر ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

’سیر لفظ سیرت کی جمع ہے اور اس کا اطلاق جہاد کے ابواب پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ان حالات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو غزوات میں پیش آئے۔ امام ابن ہمام نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

’سیر لفظ سیرت کی جمع ہے جس کے معنی طور طریقے کے ہیں۔ اور اس کا اطلاق شریعت میں مغازی میں رسول اللہ کے احوال کے ساتھ خاص ہے۔ مگر علمائے شریعت کے نزدیک اس کا اطلاق عام طور سے ان طریقوں پر ہوتا ہے جن کا حکم کفار سے جنگ میں دیا گیا۔‘<sup>۵</sup>

گویا فقہاء کتاب السیر میں جہاد و غزوات کے فضائل و مسائل احکام و قوانین اور اسی حوالے سے دیگر جزئیات فقہی انداز میں لکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک لفظ 'سیرت' انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

محدثین بھی 'سیرت' کے لفظ کو انہی محدود مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ محدثین "کتاب المغازی" میں رسول اللہ کے غزوات و سرایا بیان کرتے ہیں اور "کتاب الجہاد والسیر" میں رسول اللہ کے طور طریقے اور کفار کے ساتھ معاملات کو بیان کرتے ہیں۔ جبکہ مورخین اس لفظ 'سیرة' کو وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے سورۃ طہ کی آیت نمبر ۲۱ میں ہے "قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ" ترجمہ: فرمایا: پکڑ لے (اے موسیٰ) اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے اسی ہیئت میں کر دیں گے جیسی یہ پہلے تھی۔ یہاں اس لفظ کے معنی ہیئت، حالت، یا شکل و صورت کے ہیں۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو بعض احادیث میں لفظ "سیرت" اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک حدیث ہے:

قَامَ عَلِيُّ عَلَى الْمَنبَرِ فَذَكَرَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قَبِضْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاسْتَخْلَفْ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَعَمِلَ بِعَمَلِهِ وَسَارَ بِسِيرَتِهِ حَتَّى قَبِضَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ذَلِكَ ثُمَّ اسْتَخْلَفَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى ذَلِكَ فَعَمِلَ بِعَمَلِهِمَا وَسَارَ سِيرَتَهُمَا حَتَّى قَبِضَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ذَلِكَ۔

ترجمہ: "حضرت علیؑ منبر پر کھڑے ہوئے اور آپؐ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب آپؐ کی روح قبض کر لی گئی تو آپؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے آپؐ جیسے کام کیے اور آپؐ کی "سیرت" پر چلے،

حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو بھی قبض کر لیا۔ آپ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب کیے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان دونوں جیسے کام کیے اور ان کی سیرت پر چلے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو بھی قبض کر لیا۔

اور دوسری حدیث یہ ہے:

عن ابی وائل قال قلت لعبد الرحمن بن عوف کیف بايعتم عثمان و ترکتم علیا رضی اللہ عنہ قال ما ذنبی قد برأت بعلی فقلت ابایعک علی کتاب اللہ وسنة رسوله و سيرة ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما قال فقال فیما استطعت قال ثم عرضتها علی عثمان رضی اللہ عنہ فقبلها ۸۔

ترجمہ: ”ابو وائل سے روایت ہے کہ میں نے عبد الرحمن بن عوف سے کہا کہ آپ لوگوں نے علیؓ کو چھوڑ کر عثمانؓ کی بیعت کیوں کی؟“ انہوں نے فرمایا کہ ”اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میں نے علیؓ سے کہا تھا کہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سیرت ابو بکرؓ و عمرؓ پر تمہاری بیعت کرتا ہوں، علیؓ نے کہا تھا کہ ”میں ان میں سے جتنی بات کی استطاعت رکھوں گا، اسے سرانجام دوں گا۔“ پھر میں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں یہی بات پیش کی تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا۔“

ان احادیث میں ’سیرة‘ کا لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لفظ ”سیرت“ کا مفہوم متقدمین کے یہاں اور ہے، متاخرین کے یہاں اور۔ اور جیسا کہ اوراق گذشتہ میں اشارہ کیا گیا کہ اس لفظ کے معنی و مفہوم فقہاء کے نزدیک کچھ اور ہیں محدثین اور مورخین کے نزدیک کچھ اور۔ چنانچہ لفظ ”سیرت“ کے معنی و مفہوم کے ارتقاء کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ ابتداً اسلامی علوم و فنون کی اصطلاح میں سیرت کا لفظ، رسول اللہ ﷺ کے اس طرز عمل کے لیے استعمال کیا گیا جو آپ نے غیر مسلموں سے معاملہ کرنے میں، جنگوں میں یا صلح و

معاهدات کے معاملات میں اپنایا۔ قدیم مفسرین، فقہاء، محدثین اور سیرت نگاروں نے سیرت کے لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، 'محاضرات سیرت' میں قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں اس لفظ (سیر) کا زیادہ استعمال مسلمانوں کے اس طریقہ کار پر ہوتا ہے، جو وہ کفار، غیر مسلم، محاربین، مسلمان باغی، مرتدین، اہل ذمہ اور دوسروں سے معاملہ اور طریق کار کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔ ۹۔ یہی بات فتح القدر میں فقیہ کمال بن ہمام نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں "شریعت کی اصطلاح میں 'سیر' سے مراد وہ طریقہ ہے جو کفار سے جنگ وغیرہ میں اپنایا جائے"۔ ۱۰۔

الغرض خالص قانونی ضروریات کی خاطر، فقہائے اسلام نے بالخصوص اور محدثین نے بالعموم مغازی کی تفصیلات جمع کیں اور حضور کے ان تمام غزوات اور مہمات میں جو چیزیں قانونی اہمیت کی حامل تھیں ان کو "مغازی" کے تحت مدون کیا۔ یہ بات اہم ہے کہ مغازی کی اولین کتابیں مرتب کرنے والے فقہاتھے، مثلاً عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان وغیرہ، ان دونوں کا تعلق مدینہ کے "فقہائے سبعہ" ۱۱۔ میں ہوتا تھا۔ ان کی کتابوں کو مغازی بھی کہا جاتا تھا اور سیر بھی۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ سیر اور مغازی کی کتابیں الگ الگ ہوتی گئیں۔ مغازی کا انداز تاریخی قرار پایا اور سیر کا انداز قانونی قرار پایا۔ پھر مغازی میں رسول اللہ کی حیات مبارکہ کے دیگر پہلوؤں کی تفصیلات بھی شامل ہوتی گئیں اور اس کو سیرت کا نام دیا گیا، مغازی اس کا ایک شعبہ بن گیا۔

الغرض آج علم سیرت ایک ایسا جامع اور وسیع علم ہے جس کے بہت سے حصے اور شعبے ہیں ان میں ایک حصہ مغازی اور رسول اللہ کے غزوات اور مہمات کی تفصیلات بھی ہیں۔

غزو، غزوہ اور مغزئی (جمع مغازی) کے لغوی معنی قصد، ارادہ اور بلب کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد ”کفار سے قتال“ ہے۔ ابن حجر نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔ ”غزو کے لغوی معنی مقصد اور ارادہ کے ہیں اور یہاں مغازی سے مراد رسول اللہ ﷺ کا بہ نفس نفیس یا اپنے لشکر کے ذریعہ کفار کا قصد و ارادہ کرنا ہے۔ یہ قصد کفار کے شہروں کا ہو یا ان مقامات کا ہو جہاں وہ اترے ہوں تاکہ اس میں غزوہ احد اور غزوہ خندق وغیرہ شامل ہوں“۔ ۱۲

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مغازی سے مراد رسول اللہ کی صرف وہ مہمات نہیں جن میں کوئی عسکری یا حربی مقصد پیش نظر تھا، بلکہ اصطلاحاً غزوہ سے مراد ہر وہ مہم ہے جو مدینہ سے باہر رسول اللہ کی قیادت میں اختیار کی گئی ہو۔ خواہ اس کے نتیجے میں جنگ پیش آئی ہو یا کوئی معاہدہ کرنا مقصود ہو۔ مثلاً ہجرت مدینہ کے بعد ابتدائی مہینوں میں کئی ایسی مہمات ہوئی ہیں جن میں رسول اللہ کا واضح مقصد جنگ نہیں تھا، بلکہ مختلف قبائل سے دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا، مختلف قبائل سے مختلف نوعیت کے معاہدات کرنا اور ایک طرح سے خیر سگالی کے وفود کی ترسیل تھی لیکن محدثین اور سیرۃ نگاروں نے ان مہمات کو بھی غزوہ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ مثال کے طور پر غزوہ ابواء کا ذکر ملتا ہے جو بدر سے پہلے کی ایک مہم ہے اس میں رسول اللہ کا مقصد جنگ نہیں تھا بلکہ مقصد بنی ضمہ ۱۳ سے حلیفانہ معاہدہ تھا۔ ۱۲

خلاصہ بحث یہ کہ جب فقہانے رسول اللہ کے عسکری و حربی یا معاملات صلح و جنگ قلمبند کیے تو اس کو ”علم السیر“ (سیرت کی جمع) کا نام دیا۔ فقہانے ان معلومات سے جہاد و قتال یا بین الاقوام قوانین سے متعلق مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس طرح کے مسائل و معاملات ”کتاب السیر“ کے عنوان کے تحت درج کیے جاتے ہیں۔ علم السیر کو ”بین الاقوامی قانون“ (International Law) کہا جاتا ہے۔



دوسری طرف جب محدثین و مورخین نے رسول اللہ کے عسکری و حربی معاملات یا حالات صلح و جنگ قلمبند کیے تو اسے ”مغازی“ کا نام دیا لہذا محدثین کی مرتب کردہ کتب احادیث میں اس طرح کے حالات ”کتاب المغازی“ کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ لیکن مورخین نے ”سیر و مغازی“ کے اصطلاحی معنوں کو وسعت دی۔ اور اس کے تحت صرف رسول اللہ کی حربی و عسکری زندگی ہی کا احاطہ نہ کیا بلکہ ان کی خانگی زندگی، ان کے عادات و اطوار، شمائل نبوی، ان کے ازدواج و اولاد، ان کی رشتہ داریاں، آباء اجداد، حسب نسب بلکہ ان کی سیاست، معاشرت، معیشت، مکہ مدینہ بلکہ عرب کے احوال تک ان کی سیرت کا حصہ قرار پائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اولین سیرت نگاروں کی کتابوں کا نام ’مغازی‘ ہی ہوتا تھا۔ مثلاً مغازی عروہ بن زبیر، مغازی ابان بن عثمان، مغازی محمد بن شہاب زہری اور مغازی موسیٰ بن عقبہ وغیرہ۔ یہ سب سیرت کی کتابیں ہیں، جن میں مغازی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کے خانگی حالات اور دیگر احوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔

لفظ ”سیرت“ رسول اللہ کے حالات زندگی کے علاوہ دوسرے اشخاص کی سوانح کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً سیرة عنتر، سیرت سیف بن ذی یزن، اسی طرح ”کتاب سیرة معاویہ و بنی امیہ“ ابراہیم بن محمد فزاری (م ۱۸۸ھ) نے ”کتاب السیر فی الاخبار والاحداث“ اور واقدی (م ۲۰۷ھ) نے ”کتاب السیرة“ اور ”کتاب سیرة ابی بکر و فاتہ“ لکھی۔ آج کل بھی اس نام سے دیگر حضرات کی سوانح پر لکھا جا رہا ہے مثلاً سیرة صحابہ، سیرة امام ابن تیمیہ اور سید سلیمان ندوی کی سیرة عائشہ وغیرہ۔ تاہم جب مجرد لفظ ”سیرة“ کہا جائے گا تو اس سے مراد سیرت رسول اللہ ہوگی اور جب کسی اور شخصیت کی سیرت پر لکھا جائے گا تو سیرہ کے بعد اس کے نام کا لاحقہ ضروری ہوگا۔

سیرت اور حدیث:-

علم السیر و المغازی، علم الحدیث ہی کا ایک اہم حصہ ہے کیونکہ اس میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ان اقوال و افعال اور مقرررات سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق غزوات و سرایا سے ہے۔ خطیب بغدادی نے بھی سیر و مغازی رسول کو علم حدیث میں شامل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں انبیاء کے واقعات، زہاد اور اولیاء کے احوال، بلغاء کے مواعظ، فقہاء کے کلام، عرب و عجم کے بادشاہوں کی سیرتیں، امم ماضیہ کے قصے، رسول اللہ کے مغازی و سرایا کی تفصیلات، آپ کے احکام و قضایا، خطبے، مواعظ، معجزات، آپ کی ازواج مطہرات، اولاد و اصحاب اور ان کے فضائل و مناقب، انساب و اعمار کا ذکر ہوتا ہے۔ ۱۵

پہلی صدی ہجری کے خاتمے اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جب احادیث کی تدوین و تالیف کے بعد ان کی تبویب و ترتیب شروع ہوئی اور احکام کے استخراج و استنباط کی باری آئی تو محدثین نے مختلف انداز پر کام کرنا شروع کیا۔ ایک جماعت نے روایت و درایت کے اصول پر احادیث و آثار کو جمع کیا۔ یہ اصحاب الحدیث اور محدثین کہلائے۔ ایک جماعت نے ان احادیث و آثار سے تفقہ و افتاء کے اصول پر احکام و مسائل اور فتاویٰ مرتب کیے، یہ جماعت فقہاء کے لقب سے یاد کی گئی اور ایک جماعت نے رسول اللہ کی سیرت اور آپ کے مغازی و سرایا کو مدون کیا یہ جماعت اخباری یا مورخین کہلائے ۱۶۔ ان سب نے اپنے اپنے میدان میں اپنے کام کو آگے بڑھایا۔ جوں جوں یہ کام آگے بڑھا، ان کا فرق واضح ہونے لگا۔

سیرت اور حدیث میں بہت قریبی تعلق ہونے کے باوجود یہ دونوں علیحدہ علم قرار پائے۔ علم الحدیث کے اصول و مقاصد، علم السیرت کے اصول و مقاصد سے مختلف ہیں، پھر دونوں کے اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ یہ فرق بڑی عمدگی سے حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب 'اصح السیر' کے مقدمہ میں واضح کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

”اصحاب حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں (۱) رسول اللہ نے کیا فرمایا؟ (۲) رسول اللہ نے کیا کام کیا (۳) رسول اللہ کے سامنے یا رسول اللہ کے وقت میں کیا کیا گیا؟۔ اصحاب سیرت بھی انہی تین امور کو جمع کرتے ہیں، اس لیے اصل کام دونوں کا ایک ہی ہے، مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور رسول اللہ کی ذات سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے۔ اور اصحاب السیر کا مقصود بالذات رسول اللہ کو جاننا ہے، احکام پر ان کے ہاں بحث ضمناً ہوتی ہے۔ اس لیے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول رسول اللہ کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق پر صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن اصحاب سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوا دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ حضور نے کب ایسا کہا یا کیا؟ دوئم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ اصحاب سیرت حضور کے اقوال و افعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں، جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فعل رسول اللہ کا ہے تو وہ رسول اللہ کی سنت اور آپ کا طریقہ ہو گیا، گو یہ نہ معلوم ہو کہ رسول اللہ نے کب، کس دن، کس تاریخ ایسا کہا یا ایسا کیا۔“

اصحاب سیر بھی اصحاب الحدیث ہی ہیں مگر جب سیرت پر واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیرت کے مقاصد پورے کرنے پڑتے ہیں تو تحدیث و روایت کے شرائط اور وجہ ترجیح میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے، مغازی کے واقعات دونوں لکھتے ہیں لیکن دونوں کے لکھنے میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً فتح مکہ کے متعلق محدثین اتنا لکھتے ہیں کہ قریش نے حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑا اور بنی خزاعہ پر ظلم کیا جو رسول اللہ کے حلیف تھے، اس لیے

آپ نے حملہ کیا اور مکہ فتح ہوا۔ لیکن اصحاب سیرت یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ معاہدہ کتنا اہم تھا، اس کا پس منظر کیا تھا؟ بنی بکر اور بنی خزاعہ کی جنگ عرصہ سے چل رہی تھی۔ اس معاہدہ کی وجہ سے یہ جنگ رک گئی تھی۔ قریش نے عہد توڑ کر پھر اس جنگ کو مشتعل کر دیا تھا۔ ۱۸۔

سیرت اور حدیث میں یہ فرق بھی ہے کہ اول الذکر میں ربط و ترتیب کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن حدیث میں آپ کے حالات موجود ہونے کے باوجود سیرت کی طرح کی ترتیب لازمی نہیں۔ بایں ہمہ سیرت کا مستند تر مواد حدیث ہی میں ہے۔ اگرچہ بعض اوقات سیرت نگاروں نے روایات کے بارے میں پوری احتیاط نہیں برتی۔ ان وجہ سے حدیث کی روایت کا درجہ سیرت کی روایتوں سے بلند تر ہے۔ قرآن مجید کے بعد رسول اللہ کی سوانح عمری کا قطعی ماخذ حدیث ہی ہے، حدیث کا دائرہ وسیع تر اور اس کی غایت مختلف ہے اسی سبب سے محدثین اور ارباب سیرت کو دو الگ الگ گروہ خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۔

شبلی نعمانی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مغازی و سیرت کا علم، علم الحدیث سے مختلف ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیرت اور محدثین دو مقابل گروہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیرت ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم جیسے محدثین دوسری طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بناء پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیرت کے خلاف ہے لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح، تمام ارباب سیرت کی متفقہ روایت کے مقابلے میں بھی قابل ترجیح ہے۔ ۲۰۔

علامہ شبلی نعمانی اس موقع پر دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ایک غزوہ ذوقرد کی، جس کے بارے میں ارباب سیرت متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوہ ذوقرد، صلح حدیبیہ کے بعد اور غزوہ خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے ۲۱۔

نیز غزوہ ذات الرقاع کی نسبت ارباب سیرت کا اتفاق ہے کہ یہ جنگ خیبر سے

قبل واقع ہوا تھا لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا اس پر علامہ  
دمیاطی ۲۲ نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا۔ ۲۳

سیرت اور حدیث میں ربط و تداخل کے حوالے سے شبلی نعمانی کا نکتہ نظر یہ ہے:  
۱۔ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے، اور اس بناء پر اس  
کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ  
مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ  
نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

۲۔ مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلات مقصود ہوتی ہیں وہ فن  
حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں اس لیے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا  
معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بناء پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

۳۔ جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی  
اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام  
نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدام سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت  
ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی کی مواہب  
لدینہ کسی میں یہ التزام نہیں ۲۴۔

یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے مقابلے میں اہل سیر و مغازی کی سند کا معیار کم  
درجہ کا ہوتا ہے (تاہم ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا) کیونکہ ان کے یہاں واقعات و اخبار کا بیان  
ہوتا ہے، عقائد اور تشریحی احکام کا نہیں۔

## سیرت اور تاریخ

سیرت اور تاریخ کا ہر ارشتہ ہے، سیرت دراصل تاریخ ہی ہے جیسا کہ پہلے  
بھی لکھا گیا مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا آغاز مغازی و سیر ہی سے کیا اور ابتداء میں

مدینہ منورہ میں قرآن کے علاوہ جو چیزیں ضبط تحریر میں لائی گئیں وہ یا حدیث تھی، یا مغازی و سیرۃ۔

عربوں کے فن تاریخ اور فن سیرت نگاری دونوں نے ارتقاء کی منازل شانہ بشانہ طے کیں، فن سیرت نگاری سے فن تاریخ کو ٹھوس بنیادیں فراہم ہوئیں۔ اسلامی علوم میں فن سیرت نگاری، علم الحدیث، اور تاریخ نویسی کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا فن سیرت نگاری کی بدولت حاصل کیا اور سیرت کا فن حدیث کا مرہون احسان ہے۔ احادیث کی جانچ پڑتال کے لیے جو اصول قائم کیے گئے وہ سیرت اور تاریخ دونوں کے کام آئے۔ حدیث، سیرت اور تاریخ تینوں علوم میں مسلمانوں نے خرمع سند کا طریقہ رائج کیا ۲۵۔

پروفیسر غلام احمد حریری لکھتے ہیں ”اسلام سے پہلے نہ تو یہ طریقہ عربوں میں رائج تھا اور نہ دیگر متمدن اقوام میں۔ ایران اور یونان میں کتابت کے ذریعہ تاریخ کو محفوظ کرنے کا رواج تھا لیکن سند کا کوئی اہتمام نہ تھا دونوں قوموں کے یہاں تاریخ، ٹھوس حقائق اور مستند واقعات سے عبارت نہ تھی بلکہ دیومالائی خرافات اور ہر قسم کی خیال آرائی پر مشتمل تھی۔ ”خرمع سند“ کے طریقے کو دین اور شریعت کی خاطر مسلمانوں نے سب سے پہلے حدیث کے لیے استعمال کیا چنانچہ اس کا بھی معیار وہی رکھا جو شریعت میں قابل اعتماد ہو اس معیار کو بروئے کار لانے کے لیے کئی اور علوم وجود میں آئے جن میں تاریخ اور اسماء الرجال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حدیث اور تاریخ کے ارتباط پر نظر رکھتے ہوئے توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ تاریخ بھی وہی قالب اختیار کرے جو حدیث کا قرار پاچکا تھا چنانچہ تاریخ بھی ”خرمع سند“ کی شکل میں جمع ہونا شروع ہوئی۔ اس طرح حدیث و سیرت اور تاریخ کے فنون ایک دوسرے سے الگ ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے باہم مربوط و مماثل ہیں ۲۶۔

## حواشی و حوالہ جات (باب اوّل)

- ۱۔ مبارک پوری، قاضی اطہر 'تدوین سیر و مغازی' ص ۳۶ و ۳۷ (بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۵ء)۔
- ۲۔ غازی، محمود احمد، 'محاضرات سیرت'، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸ (الفیصل، لاہور ۲۰۰۸ء)۔
- ۳۔ ابن منظور افریقی 'لسان العرب' جلد رابع، ص ۹۰-۳۸۹۔
- ۴۔ الزبیدی، سید محمد مرتضیٰ، جلد ۳، ص ۸-۲۸۷۔
- ۵۔ ابن حجر عسقلانی، 'فتح الباری' (کتاب الجہاد و السیر) جلد ۶، ص ۳ (سلفیہ، قاہرہ)۔
- ۶۔ ابن ہمام، امام 'فتح القدر' جلد ۴، ص ۲۷۷۔
- ۷۔ مسند احمد بن حنبل، جلد اول، ص ۱۲۸۔
- ۸۔ ایضاً، ص ۷۵۔
- ۹۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، 'محاضرات سیرت'، ص ۱۷۔
- ۱۰۔ ایضاً۔
- ۱۱۔ اموی عہد میں مدینہ کے ساتھ فقہا مشہور تھے۔ اموی خلفاء بھی جب تک ان سے مشورہ نہ کر لیتے کسی بات کو قانون کا درجہ نہ دیتے۔ فقہ میں ان سات فقہا کی ذات مرجع تھی (۱) عبید اللہ بن عبد اللہ بن مسعود، (۲) عروہ بن زبیر بن عوام، (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر، (۴) سعید بن مسیب، (۵) سلیمان بن یسار، (۶) ابو بکر بن عبد الرحمن اور (۷) خارجہ بن زید۔
- ۱۲۔ ابن حجر، فتح الباری، کتاب المغازی، جلد ۷، ص ۲۷۹۔
- ۱۳۔ بنی ضمیرہ سے رسول اللہ کے تعلقات ہجرت سے قبل بھی قائم تھے۔
- ۱۴۔ محاضرات سیرت، ص ۲۰-۲۱۔
- ۱۵۔ مبارک پوری، قاضی اطہر 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۶۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۱۷۔ دانا پوری، حکیم عبدالرؤف، اصح السیر، ص ۸، مقدمہ

۱۸۔ مبارک پوری، قاضی اطہر، تدوین سیر و مغازی، ص ۱۸۔

۱۹۔ سید عبداللہ، علم (سیرة) مشمولہ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، جلد ۱، ص ۱۴۱، ص ۱۷۳-۵

(دانش گاہ پنجاب، لاہور، بار دوم ۲۰۰۱ء)۔

۲۰۔ شبلی نعمانی 'سیرة النبی' (مقدمہ) جلد اول، ص ۸۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۔

۲۲۔ حافظ عبدالمومن دمیاطی (م ۱۹۰۵ھ) ایک مشہور محدث ہیں، انہوں نے سیرت پر بھی

ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر

کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ غور و فکر کیا تو ان کو معلوم ہوا احادیث صحیحہ کو

سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اسی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی، لیکن اس کے نسخے

کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لیے نہ کر سکے۔ علامہ دمیاطی کی سیرت پر کتاب کا نام

”المختصر فی سیرة سید البشر“ ہے۔ کتاب بہت ضخیم نہیں، سو صفحات پر مشتمل ہے پٹنہ کے

کتب خانے میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے (شبلی، مقدمہ سیرة النبی جلد ۱، ص ۹ و

۳۶-۳۵)۔

۲۳۔ شبلی نعمانی، مقدمہ، ص ۱۰۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ خالد، انور محمود، اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۲۷ (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۹ء)

۲۶۔ ایضاً (بحوالہ حریری، غلام احمد 'سیرت نگاری'، ص ۴ غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ مقالہ، مخزونہ

انور محمود خالد)۔



## متقدمین سیرت نگاروں کے بنیادی ماخذ

مدینہ منورہ میں جب تابعین عظام نے سیرت نگاری شروع کی یا سیرت کے بعض پہلوؤں کو ضبط تحریر میں لانے کا عمل شروع ہوا تو ان کے پاس دو ہی اہم ماخذ تھے ایک قرآن کریم، دوسرا حدیث۔ یہاں حدیث سے مراد صرف رسول اللہ کے اقوال و احکامات ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں روایات صحابہ اور اقوال صحابہ و تابعین بھی شامل ہیں۔ سیرت نگاری کا سفر جب آگے بڑھا تو ”اسرائیلیات“ سرکاری دستاویزات اور بعض غیر مسلم علماء کے اقوال و بیانات کو بھی سیرت نگاری کا ماخذ بنایا گیا تاہم ایسا محمد ابن اسحاق نے کیا ان سے قبل کے سیرت نگاروں کے پاس قرآن اور حدیث ہی بطور ماخذ سیرت تھے۔

### قرآن کریم:-

سیر و مغازی کے بنیادی ماخذوں میں وحی الہی یعنی قرآن حکیم سب سے پہلا، مستند و معتبر تحریری ماخذ ہے۔

اصطلاحی معنی میں ’قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جو اس نے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا۔ قرآن مجید میں لفظ ”قرآن“ چھیا سٹھ (۶۶) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہ پر نازل شدہ قرآن مجید کو موقع و محل کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے متعدد ناموں سے موسوم کیا ہے۔ امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے چار نام ذکر کئے ہیں۔

۱۔ القرآن

۲۔ الفرقان

۳۔ الکتاب

۴۔ الذکر

اس کا نام ”القرآن“ اس لیے ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے، اور آیات اور سورتوں کا مجموعہ ہے نیز اس میں مختلف علوم و قصص و اخبار کو نہایت بلیغ انداز میں جمع کر دیا گیا ہے، جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے

نحنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ  
هَذَا الْقُرْآنَ ۚ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ، (۱۲ [یوسف]: ۳)  
(یعنی اے پیغمبر) ہم اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے تمہاری  
طرف بھیجا ہے تمہیں ایک نہایت اچھا قصہ سناتے ہیں اور تم اس  
سے پہلے بے خبر تھے۔

نیز ایک اور جگہ فرمایا:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ  
يَخْتَلِفُونَ، (۲۷ [النمل]: ۷۶)  
یعنی بلاشبہ یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں بیان کرتا  
ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

قرآن مجید کو ”الفرقان“ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ اس میں حق  
و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَبْرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا،  
(۲۵ [الفرقان]: ۱)

یعنی بڑی برکت والی ہے وہ ذات گرامی جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن مجید) اتارا تاکہ وہ سارے جہاں کو ڈرانے والا ہو۔  
قرآن کو ”الکتاب“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مکتوب ہے، اور اسے باقاعدہ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (البقرہ: ۲)

یعنی یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں

دوسری جگہ فرمایا:

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۗ

(الکہف: ۱)

یعنی ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر الکتاب (یعنی قرآن مجید) اتاری اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہ رکھی۔

قرآن کو ”الذکر“ کے نام سے اس لیے پکارا گیا ہے کہ اس میں اللہ نے اپنے بندوں کو پسند و نصائح سے نوازا ہے، حدود و فرائض پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی ہے اور اسرار و حکم کی پردہ کشائی فرمائی ہے۔ فرمایا:

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۗ (الزخرف: ۴۴)

یعنی بے شک یہ ذکر ہے آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے

اس کے علاوہ قرآن مجید کے متعدد صفاتی نام ہیں جو خود قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نازل فرمایا ہے۔ اصطلاح شریعت میں لفظ وحی کا اطلاق اس خاص ذریعہ نبی پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ بغیر کسی فکر و تدبر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے، صرف من جانب اللہ اور اس کے فضل خاص سے اس کے کسی نبی کو کوئی علم الہی حاصل ہوتا ہے۔ ۴

قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا، بے جا نہ ہوگا اگر اس مرقع پر عربی زبان اور اس کی چند خصوصیات کو بیان کر دیا جائے۔

## عربی زبان کی خصوصیات:

دنیا کی بڑی اور قدیم زبانیں تین ہیں

۱۔ سامی

۲۔ آریائی

۳۔ حامی

پھر ان زبانوں کی کئی شاخیں، اور ان شاخوں کی ذیلی شاخیں بھی ہیں۔ مثلاً

سامی زبان کی شاخیں آرامی، کنعانی اور عربی ہیں

آرامی زبان کی شاخوں میں کلدانی، آشوری اور سریانی زبانیں ہیں

کنعانی زبان کی شاخیں، عبرانی اور فیثقی ہیں

پھر عربی زبان بھی فصیح مضری زبان اور یمن اور حبشہ کے قبائل کی زبانوں میں منقسم ہے۔

اسی طرح آریائی زبان کی شاخیں لاطینی، یونانی اور سنسکرت ہیں۔

عربی ایک سامی زبان ہے یعنی ان قوموں کی زبان جو حضرت نوح کے بیٹے

سام کی نسل سے تھیں۔ سامی اقوام کا وطن ابتداء میں وادی فرات یا دجلہ اور فرات کے

درمیان کا علاقہ تھا۔ جب یہ تعداد میں زیادہ ہو گئے تو اس پاس کے علاقوں میں پھیل

گئے۔ بابلی اور آشوری عراق میں آگئے، آرامی شام میں، عبرانی فلسطین میں، فیثقی ساحل

شام اور لبنان میں، عرب جزیرہ نمائے عرب میں اور کچھ دوسرے لوگ حبشہ چلے گئے۔

گمان غالب یہ ہے کہ سامی زبانوں میں عربی زبان ہی اصل اور بنیادی زبان کے سب

سے زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ یہ دنیا سے نسبتاً کٹ کر رہنے کی وجہ سے ان تغیرات و

انقلابات سے محفوظ رہی جن سے دوسری زبانیں دوچار ہوئیں۔ ۵

(الف) عربی زبان کی پہلی خصوصیت اس کی قوت حیات ہے۔ یہ دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے اور اس وقت دنیا کی زندہ زبانوں میں یہ غالباً سب سے پرانی ہے۔ ۶۱۰ء میں اسلام کے ظہور سے پہلے نہ صرف یہ جزیرہ نمائے عرب میں موجود تھی بلکہ اپنے ارتقاء اور کمال کی ساری منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس زبان میں شاعری اور خطابت کے جو نمونے اسلام سے پہلے کے زمانے میں ملتے ہیں وہ فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اس کے سب سے قدیم نمونے جو دستیاب ہیں وہ ظہور اسلام سے ڈیڑھ سو برس پہلے تک جاتے ہیں۔ اس طرح عربی زبان کی معلوم عمر ساڑھے پندرہ سو برس سے بھی متجاوز ہے۔ تاہم اس کی لغت، اس کی صرف و نحو اور اس کا محاورہ اور روزمرہ آج بھی وہی ہے جو پندرہ سو برس پہلے تھا۔ کوئی شک نہیں کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ۱

دنیا کی قدیم علمی زبانوں میں سے سمیری، کلدانی، آرامی، عبرانی، فینیقی، ژند، اور سنسکرت زمانہ نزول قرآن سے بہت پہلے مردہ ہو چکی تھیں اس لیے کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی تھیں اور سریانی، یونانی اور لاطینی زبانیں زمانہ نزول قرآن کے کچھ عرصہ بعد مردہ ہو گئیں اور جدید زبانیں یعنی اطالوی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ عربی زبان اس وقت بھی زندہ تھی اس لیے کہ تمام عرب میں بولی جاتی تھی اور آج بھی زندہ ہے اس لیے کہ ایشیا کے تمام عرب ممالک اور تقریباً نصف افریقہ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک کی مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے عربی بولنے، سمجھنے اور سیکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) سے لے کر ترکوں کی تہ تیغ خلافت (۱۹۲۳ء) تک، کم و بیش ۶۶۶ سال خود عرب ممالک میں حکومتی سرپرستی سے محروم اور دربار سے خارج رہنے کے باوجود عربی پورے شان سے زندہ رہی۔ یہ زبان عربی کی قوت حیات کا حیرت انگیز مظاہرہ تھا۔

(ب) عربی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ”اعرابی زبان“ ہے۔ اعراب سے مراد کلمات کے اواخر کا زیر، زبر، پیش اور سکون میں مختلف عامل حروف لگنے سے تبدیل ہونا ہے۔ اعراب قدیم تمدن کی زبانوں کی خصوصیت ہے۔ مثلاً عربی کے علاوہ آشوری، یونانی، لاطینی اور سنسکرت، معرب زبانیں تھیں۔ لیکن انہی زبانوں سے نکلنے والی زبانیں اعراب سے مستغنی ہو گئیں۔ مثلاً یورپ میں لاطینی سے نکلنے والی زبانیں، ہندوستان میں سنسکرت سے نکلنے والی زبانیں غیر معرب ہو گئیں۔ یہی حال بابلی زبان کی شاخوں سریانی اور کلدانی کا ہوا ۱۸۱۷ء سے عربی کی وسعت معنی ہی کہا جائے گا کہ عربی میں الفاظ ہی نہیں حروف اور اعراب تک میں معنویت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ”خَلَقَ“ جسمانی پیدائش کو ”خَلَقَ“ جسمانی احساسات کو اور ”خَلَقَ“ اخلاقی احساسات کے لیے بولا جاتا ہے۔

(ج) عربی زبان کی تیسری خصوصیت نزاکت تعبیر ہے۔ یہاں معانی، الفاظ کی قلت کی شکایت کرتے نظر نہیں آتے۔ نہ صرف ہر معنی کے لیے ایک خاص لفظ ہے بلکہ معنی کی ہر شاخ کے لیے بھی الگ لفظ ہے۔ مثلاً دن کی مختلف گھڑیوں کے لیے کچھ الفاظ یہ ہیں۔ البزوغ، الضحیٰ، الغزالہ، الهاجرہ، الزوال، العصر، الاصيل، الحدود، الغروب، یا البکور، الشروق، الضحیٰ اور المتوع وغیرہ۔ اسی طرح چاندنی راتوں میں ہر رات کا الگ نام ہے۔ سر کے بالوں کی مختلف شکلوں اور حصوں کے الگ نام ہیں۔ مثلاً سر کے بالوں کو ”شعر“ کہتے ہیں بالوں کے بڑے حصے کو ”فروہ“ کہتے ہیں۔ اگلے حصے کے بالوں کو ”ناصیہ“ کہتے ہیں۔ پچھلے حصے کے بالوں کو ”ذوالبہ“ کہتے ہیں۔ اسی طرح فعلی معنی کے ہر تنوع کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف الفاظ ہیں۔ فعل نَظَرَ (دیکھنے) کی مختلف کیفیات کے اظہار کے لیے متعدد الفاظ ہیں۔ جیسے رمق، لمح، حدج، شفن، توضح، رنا، استشف وغیرہ۔ ۱۰

تجرید معنی اور انسانی جذبات کی ترجمانی کے نقطہ نظر سے عربی زبان غالباً دنیا

کی سب سے زیادہ مالدار زبان ہے۔ محبت کی کیفیات کے لیے بیسیوں الفاظ ہیں، اور اسی طرح بغض، حسد اور کینہ وغیرہ کے لیے کئی کئی الفاظ ہیں۔ افعال میں نزاکت تعبیر کی بہترین مثال مزید فیہ کے افعال ہیں کہ جن میں مشارکت کے صیغے، جو دوسری زبانوں میں کئی الفاظ کے محتاج ہیں، عربی میں صرف ایک لفظ سے ادا ہوتے ہیں جیسے ”تقاتلوا“ یعنی وہ سب مرد آپس میں لڑ پڑے۔ ”تحاسدوا“ یعنی ان سب مردوں نے ایک دوسرے سے حسد کیا۔ وغیرہ۔ ۱۱

(د) عربی زبان انتہائی مالدار زبان ہے جو اپنے اندر اظہار کی بے کراں وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ مترادف (یعنی ایک معنی کے لیے کئی الفاظ کی موجودگی) ایک ایسی لسانی خصوصیت ہے جس میں اہل عرب تمام اقوام سے بازی لے گئے ہیں مثلاً سال کے، روشنی اور تاریکی کے، سورج اور بادلوں کے بیسیوں نام ہیں جبکہ شراب، شیر اور اونٹنی کے سینکڑوں نام ہیں۔ مترادفات کے علاوہ ’اضداد‘ کی فہرست بھی خاصی طویل ہے یعنی ایک ہی لفظ متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً باع کے معنی خریدنا بھی ہیں اور بیچنا بھی، جون کے معنی سیاہ بھی اور سفید بھی، قسط کے معنی انصاف بھی اور ظلم بھی، جلال کے معنی عظیم بھی اور حقیر بھی ۱۲۔ مولیٰ کے معنی آقا بھی اور غلام بھی۔ ۱۳

کثرت مترادف اور تعدد معانی کی وجہ سے عربی زبان اپنے اندر اظہار کی بے پناہ قوت اور وسعت لیے ہوئے ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر اس زبان میں جمع نہایت آسان ہو گئی۔ اس زبان کا عہد جاہلی میں نمونہ کاہنوں کی زبان اور عہد اسلامی میں خطباء کی زبان ہے۔ کثرت مترادف کی بناء پر ہی غیر منقوط نویسی کا رواج ہوا۔ ۱۴

(ه) عربی زبان کی ایک اور خصوصیت اعجاز و ایجاز ہے۔ یعنی مختصر الفاظ سے کثیر معانی پر دلالت کی جاتی ہے۔ اہل عرب دوسروں کے مقابلے میں اس لسانی خصوصیت پر بھی زیادہ قادر تھے۔ عربی شاعری کے علاوہ قرآن و حدیث، امثال کی کتابیں

اور دیگر ادبی مصادر اس خصوصیت کے واضح دلائل ہیں۔ نیز امثال کے استعمال نے عربی کی بلاغت کو دو چند کر دیا ہے۔ ”امثال سے مراد وہ بلیغ سبق آموز کلام ہے جو انسان کی عقل سلیم کے طویل تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔“ امثال جاہلی اور اسلامی عہد میں اہل عرب کے حکیمانہ اقوال ہیں۔ جن کی تین خصوصیات ہیں (۱) مختصر الفاظ (۲) دل میں اتر جانے والے معنی اور (۳) تشبیہ کا حسن۔ اس طرح کے امثال اہل عرب میں زبان زد عام تھیں اور وہ انہیں بغیر کسی تصریح کے بلا تکلف اپنی گفتگو اور اپنے اشعار میں استعمال کرتے۔ ۱۵۔

(و) عربی زبان کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی صوتیات، انسانی جذبات کی بہترین ترجمان ہیں۔ گویا صوت اور معنی میں کامل ہم آہنگی ہے۔ یہ نظریہ جو Sound Symbolism کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور جس سے مراد یہ ہے کہ زبان میں اصوات ایک تعبیری قیمت رکھتی ہیں اور ہر صوت کا اپنے مدلول کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ عربی کی اسی خصوصیت کی بناء پر بہت سے اہل علم کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ عربی ”ام اللسنہ“ ہے کیونکہ عربی زبان نے ابتدائی آوازوں کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ وہ ان تمام کڑیوں کا بھی پتا دیتی ہے جن کی طرف دنیا کی دوسری قدیم زبانیں کم رہنمائی کرتی ہیں۔ ۱۶۔

## مدوین قرآن:

قران مجید کے تاریخی واقعات کو اعلیٰ درجہ کا استناد حاصل ہے کیونکہ یہ دنیا کی مستند ترین کتاب ہے۔ یہ بات صرف قران ہی سے مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح رسول اللہ پر نازل ہوئی بعینہ موجود و محفوظ ہے، درآں حالیکہ اس سے قبل کی الہامی کتابیں تحریف کا شکار ہوئیں یا تلف ہو گئیں۔ جبکہ قران کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے نازل کرنے والے نے اٹھایا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ۝ (الحجر۔ ۹)



بے شک ہم نے اس ذکر (قران) کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں لہذا قران میں بیان کردہ ہر ہر بات شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کی شہادت موجود ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (البقرہ-۲)

یہ ایک نوشتہ (کتاب) ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے

سورہ حم السجدہ کی بائیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

”قران میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے“

قران مجید کی اندرونی داخلی شہادتوں اور خارجی شہادتوں سے قران کی تدوین اور اس کی کتابت و حفاظت ثابت ہے۔ آج جو قران مجید ہے وہ اسی ترتیب اور صورت میں ہے جس میں کہ رسول اللہ نے اپنے سامنے اس کی کتابت کرائی، صحابہ کرام کو حفظ کرایا۔ نہ اس کی ترتیب میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ حروف و کلمات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ خود قران مجید اور حدیث رسول میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (۷۵ [القیامۃ]: ۱۷)

(یعنی اے رسول اکرم) بلاشبہ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے

جمع قران مجید اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں خود قران مجید ہی میں واضح کہا

گیا ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) جمع صدور: یعنی قران کو سینوں میں محفوظ کر دینا۔

(۲) جمع مکتوب: یعنی تحریر و کتابت کی صورت میں اس کی جمع و تدوین۔

جمع صدور کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: (ترجمہ) ”یہ قران مجید روشن

اور واضح آیات کا مجموعہ ہے جو اصحاب علم کے سینوں میں محفوظ ہے (۲۹ [العنکبوت]: ۴۹)

جمع مکتوب کا ذکر متعدد مقامات ۱۸ پر کیا گیا ہے مثلاً

رَاطُورِہ وَاكْتَبِ مَسْطُورِہ فِی رَقِی مَنَّشُورِہ (۵۲ [الطور]: ۱-۳)

متم ہے طور کی، اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے۔

قران مجید کی کتابت و حفاظت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیر

ربیع الاول ۴ نبوی کو دوسری وحی نازل ہوئی اور تبلیغ کا حکم ہوا۔ جمعرات کو حضرت خالد بن

سعید مشرف بہ اسلام ہوئے ان سے رسول اللہ نے کتابت شروع کرائی۔ اس طرح نزول

وحی کے چوتھے دن سے کتابت شروع ہوگئی جو نزول قران کے اختتام تک برابر جاری

رہی۔ مورخین نے کاتبان وحی کی تعداد (۴۲) بیالیس تک بتائی ہے۔ کاتبوں کی اتنی بڑی

تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کام کو انجام دے

دے۔ ایک صحابی حنظلہ بن ربیع کو حکم تھا کہ کوئی رہے نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ

کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی

آیت قلمبند ہو جاتی تھی۔ مزید احتیاط یہ تھی کہ رسول اللہ صرف لکھوانے پر ہی قناعت نہیں

فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے، اصلاح کی ضرورت ہوتی تو

اصلاح فرماتے، تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا۔ پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے

تھے۔ حضرت زید بن ثابت کے الفاظ میں ”جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور مجھ کو

بلا تے تھے میں تختی اور دوات قلم لے کر حاضر ہوتا۔ آپ لکھاتے، لکھا کر پھر سنتے، اگر

کوئی غلطی ہوتی تو صحیح کر دیتے۔“ ۱۹

یہ بات مزید قابل ذکر ہے کہ قران کی کتابت کے لیے بغایت احتیاط بہترین

چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا، جن میں رقاہ (چمڑا یعنی چرمی قطعات) لحاف (پتھر کی سفید

پتلی پتلی تختیاں)، کتف (اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی) عسیب (کھجور کی شاخوں کی جڑ

کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) ادیم (باریک کھال

سے دباغت کے عمل سے تیار کردہ) اقباب (قرب کی جمع، اونٹ کے کجاوہ کے چڈڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے) وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ایک طویل مدت تک آفات و حوادث سے حفاظت رہے۔ ۲۰

غرض اس حزم و احتیاط کے ساتھ قرآن مجید اپنی مدت نزول میں تحریراً جمع ہوتا رہا۔ حیات نبوی میں جن صحابہ کرام نے مکمل قرآن جمع کیا ان کے نام محمد ابن حبیب بغدادی نے اپنی کتاب المحبر میں دیئے ہیں۔ ان میں

۱۔ سعد بن عبید ابن نعمان اوسیؓ (انہوں نے سب سے پہلے پورا قرآن جمع کیا)

۲۔ ابو درداء عومیر بن زید بن قیسؓ خزرجی

۳۔ معاذ بن جبل بن عمرو خزرجیؓ

۴۔ ثابت بن زید بن نعمان خزرجیؓ

۵۔ اُبی بن کعب بن مالک نجاریؓ

۶۔ زید بن ثابت بن ضحاک نجاریؓ ۲۱

اس کے علاوہ متعدد صحابہ کرام ایسے تھے جن کے پاس قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ تحریراً محفوظ تھا۔ قرآنی سورتوں اور آیات کی ترتیب، رسول اللہ کی دی ہوئی ہے۔ یعنی توفیقی ہے، جس میں کوئی رد و بدل کسی بھی مرحلہ پر نہیں ہوا۔ نزول قرآن جس روز مکمل ہوا اسی روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہو گئی۔ جو اس کا نازل کرنے والا تھا وہی اس کا مرتب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا اسی کے ہاتھوں اسے مرتب بھی کرادیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور اس کو فرو کرنے کے لیے مسلمانوں کو خونریز جنگیں لڑنی پڑیں تو ان معرکوں میں ایسے صحابہ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی جن کو پورا قرآن حفظ تھا۔ روایت ہے کہ جنگ یمامہ میں سات

سوائے مسلمان شہید ہو گئے جو حافظ قرآن تھے ۲۲ اس سے حضرت عمر کو خیال پیدا ہوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعہ پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں بلکہ الواح قلب کے ساتھ ساتھ صفحات پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے، لہذا اس امر کی طرف انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توجہ کرائی اور کچھ تامل کے بعد انہوں نے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو، جو رسول اللہؐ کے وقت کاتب وحی رہ چکے تھے، اس خدمت پر مامور فرمایا۔ یوں تو قرآن کل کا کل عہد رسالت میں لکھوایا جا چکا تھا لیکن انہیں ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروانے کا کام سرکاری سطح پر عہد صدیقی میں ہوا۔ اور قرآن مجید کا ایک نسخہ تیار کر کے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ہاں رکھو ادیا گیا اور عام لوگوں کو اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کر لے اور جو چاہے اس سے موازنہ کر کے اپنے نسخے کی تصحیح کر لے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں فرق تھا۔ قرآن مجید اگرچہ نازل اس زبان میں ہوا تھا جو مکہ میں اہل قریش بولتے تھے، تاہم دیگر علاقوں کے لوگ ابتداً اپنے لہجوں کے مطابق اسے پڑھا کرتے تھے۔ اور چونکہ اس سے معنی تبدیل نہیں ہوتے تھے لہذا اس سے صرف نظر بھی کیا گیا۔ مثلاً بنی ہذیل ”حتیٰ حین“ کو ”عتیٰ عین“ پڑھتے تھے اسی طرح بنو اسد تعلمون کی ”ت“ کو زیر ( ر ) کے ساتھ تلفظ کرنے، تھے۔ اسی طرح تابوت کا تلفظ اہل مدینہ ”تابوہ“ کرتے تھے۔ ۲۳

پھر رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عربوں نے جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر متمدن ممالک فتح کر لیے اور دوسری قوموں کے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو عرب و عجم کے اس اختلاط نے عربی زبان کو متاثر کیا۔ اس وقت یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر اب بھی دوسرے لہجوں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان اور دیگر

اصحاب کرام کے مشورے سے حضرت عثمان غنی نے یہ طے کیا کہ تمام ممالک اسلامیہ میں صرف اس معیاری نسخہ قرآن کی نقلیں تیار کی جائیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے حکم سے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا اور باقی تمام دوسرے لہجوں پر لکھے ہوئے مصاحف کو بحق سرکار ضبط کر کے معدوم کر دیا گیا۔ تمام امت محمدیہ کو ایک مصحف پر جمع کرنا یہ حضرت عثمان کی بہت بڑی خدمت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں شائع ہونے والے قرآن کا تقابل کسی بھی عہد میں کسی بھی ملک میں شائع ہونے والے قرآن سے کیا جاسکتا ہے۔ کوئی اس میں سرمو اختلاف نہیں پائے گا۔

## قرآن بطور ماخذ تاریخ:

قرآن مجید بنیادی طور پر رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو مختلف معجزانہ اسلوب بیان اختیار فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گذشتہ قوموں کے واقعات و قصص و اخبار کے ذریعہ ان کے اچھے اور برے اعمال کے ثمرات اور نتائج کو یاد دلائے اور عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کرے، اس لیے جب قرآن میں تاریخی واقعات بیان کیے جاتے ہیں تو اس کا مقصد تاریخ نگاری نہیں ہوتا لہذا وہ تاریخی انداز بیان کے درپے نہیں ہوتا بلکہ ابلاغ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیش نظر صرف انہی تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے جو اس غرض و غایت کو پورا کرتے ہوں اور اسی لیے قرآن کریم میں بعض تاریخی واقعات یا گذشتہ انبیاء کے بیان میں تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کو متوجہ کر سکیں۔ توجہ حاصل کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ یہ ہے کہ ایک بات کو مختلف پیرائے بیان اور مختلف حالات کی مناسبت سے بار بار دہرایا جائے اور سوئی ہوئی انسانی فکر کو بار بار جگانے کی کوشش کی جائے۔ ۲۴۔ قصص و اخبار کے بیان کے چند اہم مقاصد تھے جو قرآن پورا کرنا چاہتا تھا۔

**مقصد اول:** امم سابقہ کے حالات بیان کر کے اللہ تعالیٰ رسول اللہ اور جماعت مسلمین

کی ہمت بندھانا چاہتا تھا۔ ان واقعات اور قصص کے ذریعہ رسول اللہ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ گذشتہ اقوام بدرجہ غایت باغی اور سرکش تھیں، انہوں نے انبیاء کی تکذیب بھی کی اور انہیں ستایا بھی مگر انبیاء کرام نے ہمت نہیں ہاری اور سلسلہ دعوت ہر حال میں جاری رکھا۔ قرآن کا مقصد کفار مکہ، مشرکین عرب اور دیگر اعدائے اسلام کے مقابلے میں رسول اللہ کی حوصلہ افزائی کرنا اور آپ کی ہمت بڑھانا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید انبیائے سابقین کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

”اے پیغمبر اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کی تکذیب ہو چکی ہے جو معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے“ (۳ [آل عمران]: ۱۸۴)

دوسری جگہ فرمایا: ”(یعنی اے پیغمبر) آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی جا چکی ہے پس انہوں نے اس پر صبر کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذا دی گئی، یہاں تک کہ ہماری نصرت ان کو پہنچی اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں اور آپ کے پاس پیغمبروں کے کچھ قصے تو پہنچ ہی چکے ہیں۔“ (۶ [الانعام]: ۳۴)

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں کئی مقامات پر موجود ہیں، جن میں امم سابقہ کی سرکشی اور ان کے مقابلے میں انبیاء کرام کی عزیمت کا ذکر کر کے رسول اللہ کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

**مقصد دوم:** قرآن مجید کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں کسی گروہ یا فرد کے باقاعدہ حالات و سوانح ترتیب وار درج ہوں بلکہ یہ موعظت و عبرت کا ایک تذکرہ ہے، جس کے ذریعہ اپنے مخاطبین کو نافرمان اقوام کے انجام سے ڈرانا اور ترغیب و ترہیب کے سامان بہم پہنچانا ہے۔ قرآن میں جو تاریخی واقعات و قصص بیان کیے گئے ہیں ان کا ایک اہم مقصد مقامات عبرت و بصیرت کی نشاندہی کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ مخالفین حق و

صداقت کا انجام یہی ہوا کرتا ہے، اور ان کے اعمال بد کی سزا بہر حال انہیں مل کر رہتی ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

”(اے نبی) اسی طرح ہم آپ سے واقعات گذشتہ کی خبریں بیان کرتے ہیں اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ (یعنی قرآن) عطا کر دیا ہے۔“ (۲۰ [طہ]: ۹۹)

قرآن نے ان واقعات و قصص میں اصحابِ عقل اور اربابِ فہم کے لیے عبرت و موعظت کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

”(ان انبیاء و امم سابقہ) کے قصوں میں سمجھ داروں کے لیے بڑی عبرت پنہاں ہے“ (۱۲ [یوسف]: ۱۱۱)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں، اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انہیں ”ایام اللہ“ سنا کر نصیحت کر۔ ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہے۔“ (۱۴ [ابراہیم]: ۵)

”ایام“ کا لفظ عربی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لیے بولا جاتا ہے۔ ”ایام اللہ“ سے مراد تاریخ انسانی کے وہ اہم ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ زمانہ کی قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کے اعمال کے اعتبار سے جزایا سزا دی۔ ۲۵ سورۃ قمر میں جہاں حضرت نوح اور ان کی قوم کا قصہ بیان کیا گیا وہاں فرمایا

”ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟“ (۱۵۴ [القمر]: ۱۷)

**مقصد سوم:** ان اخبار و قصص کو بیان کرنے کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کے امتحاناً پوچھے گئے سوالات کے درست جواب فراہم کر کے قرآن کو کتاب برحق اور رسول اللہ کو پیغمبر برحق ثابت کیا جائے۔ اس زمانے کے علمائے یہود و نصاریٰ بھی گذشتہ اقوام کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ نہیں جانتے تھے جس طرح قرآن میں بیان کیے گئے۔ اہل کتاب اکثر آپ سے امتحاناً بعض واقعات کی تفصیل اور بعض قصص کی صحت کے بارے میں سوال کرتے اور آپ سے تسلی بخش جواب پاتے۔ چنانچہ قصہ اصحاب کہف، قصہ یوسف، قصہ ذوالقرنین، قصہ لقمان، قصہ موسیٰ و خضر، انہی اہل کتاب کے سوالات کے جواب میں نازل کیے گئے۔ یہ وہ واقعات تھے جن سے اہل عرب عموماً واقف نہیں تھے۔

**مقصد چہارم:** قرآن کریم میں بعض قصص تاریخی دلیل کے طور پر پیش کیے گئے ہیں مثلاً حضرت داود، حضرت سلیمان اور سب کا قصہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے مقصود یہ حقیقت ذہین نشین کرنا ہے کہ روئے زمین پر خود نوع انسانی کی اپنی سرگزشت قانون مکافات کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں جس کا سارا کارخانہ اندھا دھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر اور قادر مطلق ذات فرمانروائی کر رہی ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری کرنے والے اور کفران نصیحت کرنے والوں کے ساتھ ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ ۲۶

**مقصد پنجم:** ویسے تو قرآن کریم دنیا بھر کے اہل علم کے لیے نصیحت ہے مگر جہاں تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں وہاں بعض اوقات براہ راست قریش کو تنبیہ کی گئی ہے اور بعض ایسی کھلی نشانیوں کی طرف اشارا کیا گیا ہے جو باسانی ان کے مشاہدے میں آسکتی تھیں۔ مثلاً سورہ العنکبوت آیت نمبر ۳۵ میں جس کھلی نشانی کا ذکر ہے اس سے مراد بحیرہ مردار



ہے، جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر (یعنی قوم لوط پر) اس کے گھناؤنے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہ عام پر موجود ہے جسے شام کی طرف تجارتی سفر کے دوران وہ دیکھتے تھے۔

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بحیرہ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلہ کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصہ میں قوم لوط کا مرکزی شہر سدوم (SODOM) واقع تھا۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلات غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے۔ ۲۷

اسی طرح قریش کو عاد و ثمود کے بارے میں بتایا گیا ”عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔“ (۲۹ [العنکبوت]: ۳۸)

عرب کے جن علاقوں میں یہ دونوں قومیں آباد تھیں ان سے اہل عرب بخوبی واقف تھے جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اب احقاف، یمن اور حضرموت کے نام سے معروف ہے، قدیم زمانے میں عاد کا مسکن تھا اور اہل عرب اس کو اچھی طرح جانتے تھے، اسی طرح حجاز کے شمال میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ و خیبر سے تیما و تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے اور نزول قرآن کے زمانے میں یہ آثار زیادہ ہی نمایاں رہے ہوں گے۔ ۲۸ سورۃ یونس میں اہل عرب سے براہ راست خطاب کر کے فرمایا:

اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے تاکہ

دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔“ (۱۰ [یونس]: ۱۴)

یعنی اہل عرب اور کفارِ مکہ سے براہ راست کہا جا رہا ہے کہ کچھلی اقوام کو مہلت ملی مگر انہوں نے بغاوت اور سرکشی کی روش اختیار کی، تو ان سے دنیا کو پاک کر دیا گیا، ان کی جگہ اب تمہیں (یعنی اہل عرب کو) کام کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا حشر بھی ان قوموں جیسا ہو تو تاریخ سے سبق حاصل کرو اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرہ جو ان کی تباہی کا موجب ہوئیں۔

ان تینوں مقاصد کو سورہ ہود میں بڑی خوبصورتی سے یکجا بیان کیا گیا ہے:

”(یعنی) پیغمبروں کے قصوں میں سے یہ سب قصے ہم آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور ان قصوں کے اندر آپ کے پاس حق پہنچا ہے اور ان میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔“ (۱۱ [ہود]: ۱۲۰)

## قرآن بطور ماخذ سیرت

قرآن مجید نے جہاں امم سابقہ کے حالات و واقعات سے پردہ اٹھایا ہے وہیں رسول اللہ کی حیات مبارکہ، ان کی خانگی و اجتماعی زندگی، ان کے عہد کے احوال پر بھی ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ معلومات قرآن میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں یہ معلومات انتہائی معتبر اور درست ہیں کہ قرآن سے زیادہ معتبر اور کوئی ماخذ موجود نہیں۔ یہ بات مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی تسلیم کی ہے۔ ولیم میور کہتے ہیں ”قرآن کی اس خصوصیت میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ محمد (ﷺ) کی سیرت اور ابتدائی اسلامی تاریخ معلوم کرنے کے لیے اس میں بنیادی باتیں موجود ہیں اور محمد (ﷺ) کی زندگی کے تمام تحقیق طلب امور اس کے ذریعہ صحت کے ساتھ جانچے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں محمد (ﷺ) کے مذہبی خیالات، ان کے اجتماعی افعال، اور ان کی نجی زندگی کے متعلق تمام مواد قرآن میں مکمل طور پر مل جاتا ہے۔ محمد (ﷺ) کی سیرت اور ان کا کردار معلوم کرنے کے لیے قرآن ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں سب کچھ صاف صاف نظر آ جاتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مسلمانوں میں یہ بات ضرب المثل کے طور پر مشہور تھی کہ آپ کی سیرت، قرآن ہے۔“ ۲۹

قرآن مجید عام کتابوں سے بالکل مختلف، اپنے مقصد، مدعا، ترتیب اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے ایک انتہائی مختلف کتاب ہے۔ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی یہ ایک ہی کتاب ہے۔ اس کتاب میں نہ تو موضوعات کی ترتیب ہے اور نہ ہی ابواب و فصول کی تقسیم۔ یہاں تاریخ ہے مگر تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ اور مابعدالطبیعات ہیں تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں، انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو علوم طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو عمرانی علوم کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو قانون کی کتابوں سے بالکل مختلف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی تکمیل تک تیس سال کی مدت میں جن جن مراحل سے گذرتی رہی، ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب ہو ہی نہیں سکتی جو ڈاکٹریٹ کی رگری لینے کے لیے کسی مقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ یا جو کسی خاص موضوع پر تحقیقی کتاب تصنیف کرتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ ۳۰

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی و اجتماعی زندگی کے اہم احوال قرآن مجید میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کوئی سیرت نگاروں نے مرتب کر کے کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً مولانا عبدالشکور لکھنوی نے ”الحبیب الشفیع من کتاب العزیز الرفیع“ نامی کتاب سیرت پر لکھی۔ مرزا حیرت دہلوی کی ”سیرت قرانیہ“، مولانا ابوالکلام آزاد کی ”نبی رحمت“، خواجہ احمد الدین امرتسری کی ”قرآن کریم اور سیرت حمید“، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب ”خطبات سیرت قرانی“، مفتی انتظام اللہ شہابی کی ”قرانی سیرت“، غلام احمد پرویز کی

”معراجِ انسانیت“، اور محمد عثمان قریشی کی ”سیرت دانائے سبل“، اسی طرز کی کتب سیرت ہیں۔ ۳۱۔

قرآن مجید میں ایک طرف آپؐ کی زندگی کے اہم پہلو واضح کئے گئے ہیں تو دوسری طرف آپ کے عہد کے بعض وقائع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ان جھوٹے الزامات کا بھی احاطہ کیا ہے جو کفار رسول اللہ پر عائد کرتے تھے۔ قرآن نے ان الزامات کے بڑے منطقی اور مدلل جواب دے کر رسول اللہ کے حقیقی اوصاف کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رہے آپ کے اخلاق و آداب تو ان سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

”اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور صرف قرآن ہی باقی رہے تب بھی آنحضرت کی شخصیت مقدسہ اور آپؐ کی سیرت و حیات کے براہین و شواہد مٹ نہیں سکتے کیونکہ یہ صرف قرآن ہے جو ہمیشہ دنیا کو بتلاتا رہے گا کہ اس کا لانے والا کون تھا؟ کس ملک میں پیدا ہوا؟ اس کے خویش و یگانہ کیسے تھے؟ قوم و مرزبوم کا کیا حال تھا؟ اس نے کیسے زندگی بسر کی؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا؟ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کیسے کتنی تھیں؟ اس نے کتنی عمر پائی؟ کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے؟ پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کس عالم میں چھوڑ لیا؟ اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی تو دنیا کا کیا حال تھا؟ اور جب واپس نظر و داعِ ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔“ ۳۲۔

ایسے ہی خیالات کا اظہار مولانا مودودی کرتے ہیں ”اگر کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ دنیا سے مٹ جائے جو آئمہ اسلام نے سالہا سال کی محنتوں سے مہیا کیا ہے، حدیث و سیر کا ایک ورق بھی دنیا میں نہ رہے جس سے محمد ﷺ کی زندگی کا کچھ حال معلوم

ہوسکتا ہو، اور صرف کتاب اللہ (قران) ہی باقی رہ جائے تب بھی ہم اس کتاب سے ان تمام بنیادی سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں، جو اس کے لانے والے کے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔“ ۳۳

## حواشی و حوالہ جات (باب دوم، فصل اوّل)

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ 'قرآن مجید'، دانشگاه پنجاب، لاہور، جلد ۱۶/۱، ص ۳۱۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۹

۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے دائرہ جلد ۱۶/۱، ص ۳۲۱ تا ۳۲۲۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ محمد کاظم، 'عربی ادب کی تاریخ' (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۵۔

۶۔ ایضاً (موازنہ کے لیے یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ انگریزی زبان کی عمر تقریباً چھ سو سال ہے، اردو زبان کی تقریباً چار سو سال، البتہ فارسی زبان ان دونوں سے قدیم ہے اور اس کی عمر گیارہ سو برس سے کچھ متجاوز ہے)۔

۷۔ صولت علی خان 'اسلام اور مسلمان' (کراچی، ۱۹۵۶ء) جلد اول، ص ۲ (حاشیہ)۔

۸۔ احسان الحق، 'اردو عربی کے لسانی رشتے' (قرطاس، کراچی، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۸-۵۹۔

۹۔ اسلام اور مسلمان، جلد اول، ص ۳۔

۱۰۔ اردو عربی کے لسانی رشتے، ص ۵۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۰۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۱۳۔ ظہیر، نگار سجاد، 'عرب اور موالیٰ' باب اول (قرطاس، کراچی ۲۰۰۵ء)۔

۱۴۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے 'اردو عربی کے لسانی رشتے' از ڈاکٹر احسان الحق۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۲ (مزید مطالعہ کے لیے رجوع کیجئے۔ محمود شکاری آلوسی کی کتاب 'بلوغ

الارب)۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۱۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے 'مدوین قران' از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مکتبہ اسحاقیہ، کراچی ۱۹۸۶ء۔

۱۸۔ مثلاً سورہ الواقعہ آیات ۷۷ تا ۷۹، سورہ عبس آیات ۱۱ تا ۱۶، سورہ البروج آیات ۲۱ تا ۲۲، سورہ البینہ آیات ۲، ۳، وغیرہ۔

۱۹۔ خورشید احمد 'اسلامی نظریہ حیات' شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۳۳۵۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ بغدادی، محمد ابن حبیب 'کتاب المحبر'، ص ۲۸۶۔ (دارہ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دین ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء)

۲۲۔ عہد نبوت میں بھی بیسرمعونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے شہید ہونے والوں کی تعداد ستر کے قریب تھی، اور یہ سارے کے سارے قراء یعنی حافظ قران تھے ('مدوین قران' از مناظر احسن گیلانی، ص ۴۶)۔

۲۳۔ غلام ربانی "مدوین قران یعنی قران کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر"، ص ۵۹۔

۲۴۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمن 'قصص القران' جلد اول، ص ز، ح (پیش لفظ) (لاہور، ت ن)۔

۲۵۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ 'تفہیم القران' جلد ۱، ص ۴۷۱ (ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۹۷ء)۔

۲۶۔ ایضاً جلد ۴، ص ۱۹۱۔

۲۷۔ ایضاً جلد ۳، ص ۹-۶۹۸۔

۲۸۔ ایضاً جلد ۳، ص ۷۰۰۔

۲۹۔ ولیم میور لائف آف محمد (تعارف)، ص ۲۸۔

۳۰۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، 'تفہیم القرآن' جلد ۱، ص ۱۴ (مقدمہ)

۳۱۔ شکیل اوج، 'قرآن بطور ماخذ سیرت' مشمولہ 'الایام' جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری / جون ۲۰۱۰ء، ص ۴۷، کراچی۔

۳۲۔ آزاد، مولانا ابوالکلام رسول رحمت (مرتبہ مولانا غلام رسول مہر) ص ۱۹-۲۰۔

۳۳۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سیرت سرور عالم، جلد ۲، ص ۳۱۔



## حدیث

### معنی و مفہوم:

متقدمین سیرت نگاروں نے قرآن کے بعد جس ماخذ پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا وہ احادیث رسول تھیں۔ حدیث کے لغوی معنی تو خبر یا بیان کے ہیں اسی سے حدوث، حادثہ اور حادث جیسے الفاظ بنے ہیں تاہم اصطلاحاً اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کا قول، فعل یا تقریر ہے۔

درحقیقت حدیث کی یہ ایک سطر کی تعریف بڑی جامع ہے۔ اس کی وسعتوں کا ادراک کیا جائے تو یہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے۔ حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں رسول اللہ کو انسانیت کی فلاح کے لیے مبعوث کیا گیا۔ علماء نے سنت اور حدیث کو مترادف مانا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں نبی کریمؐ سے جو قول، فعل، تقریر، جسمانی یا اخلاقی صفت اور سیرت قبل یا بعد از بعثت منقول ہو اس کو سنت کہتے ہیں۔ اس تعریف کے لحاظ سے بعض محدثین کے نزدیک حدیث اور سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

قرآن میں جہاں لفظ ”حکمت“ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی بھی حدیث کے لیے جاتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ  
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ  
كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

(اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا جبکہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج دیا جو ان کو قرآن کی آیات پڑھ کر سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ قبل ازیں وہ کھلی گمراہی میں تھے۔) (آل عمران - ۱۶۴)

جمہور علماء و محققین کا قول ہے کہ ”حکمت“ قرآن کے علاوہ ایک چیز ہے۔ حکمت سے دین کے وہ اسرار و احکام مراد ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع دی۔ علماء ”حکمت“ کو سنت اور حدیث سے تعبیر کرتے ہیں۔ حدیث جیسی کوئی چیز، کسی قوم کے لٹریچر میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسی بنیاد پر یہ دلچسپ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قرآن کے مماثل، الہامی کتابیں دیگر مذاہب میں ہیں لیکن حدیث کے مماثل دیگر قوموں میں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

### ضرورت و اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رسول اللہ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر - ۷)

(اور رسول جو چیز تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (آل عمران - ۱۳۲)

(اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے) ۵

اب جبکہ رسول اللہ کا اتباع اور اطاعت لازمی ٹھہرا اور قرآن کی رو سے ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ کرے، تو اس بات کی بھی شدید ضرورت ہوگی کہ آپ کی سنت اور حدیث اور اسوہ کو حتیٰ

الامکان محفوظ کیا جائے، اسی ضرورت نے مسلمانوں کو آپ کی ایک ایک ادا محفوظ کرنے اور ایک ایک قول کو حفظ کرنے پر آمادہ کیا۔ خود رسول اللہ کو بھی حدیث کی حفاظت و روایت منظور و مطلوب تھی یہی وجہ تھی کہ جب آپ گفتگو فرماتے تو آہستہ آہستہ اور خوب وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے تاکہ سننے والے اچھی طرح سن لیں۔ ضروری باتوں کو آپ تین تین مرتبہ دہراتے تاکہ حاضرین یاد کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے روایت حدیث کی ترغیب دلاتے ہوئے مختلف مواقع پر ارشادات فرمائے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ اس شخص کو مسروز شاد کام رکھے جس نے میری بات سنی اسے خوب یاد رکھا اور جیسے سنا تھا جوں کا توں اسے آگے پہنچا دیا“۔ ۶

حجۃ الوداع کے تاریخی موقع پر خطبہ ارشاد کرنے کے بعد مشہور تاریخی جملہ فرمایا

الَا فَلَیْلُغَ الشَّاهِدِ الْغَائِبِ

”چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے“ (صحاح)

ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ”تم مجھ سے سنتے ہو، دوسرے لوگ تم سے سنیں گے اور پھر ان سے اور لوگ سنیں گے۔“

اس کے ساتھ ہی آپ نے صحت حدیث کو قائم رکھنے کے لیے فرمایا:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

(جو شخص قصداً میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے) ۷

## تدوین حدیث:

احادیث نبوی کی سرکاری سطح پر تدوین کا منظم کام تو حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کے عہد میں شروع ہوا، تاہم یہ ثابت شدہ امر ہے کہ عہد رسالت سے ہی بعض صحابہ نے رسول اللہ کے اقوال و احوال کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ حدیث کے زمرے میں رسول اللہ کے احکامات بھی آجاتے تھے لہذا سینکڑوں خطوط، معاہدات،

احکامات، سیاسی و ثقہ جات خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی نگرانی میں لکھوائے۔ یہ سب حدیث ہی کا ذخیرہ جانے جاتے ہیں لہذا یہ کہنا کہ حدیثیں دوسری یا تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئیں علمی بددیانتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے مغربی محققین حدیث کے استناد کو چیلنج کرتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ حدیث کے متداول مجموعے تیسری صدی ہجری میں تالیف کیے گئے چنانچہ وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ ان کے خیال میں ان مجموعوں کا انحصار زبانی روایات پر ہے۔ لہذا بھول چوک، اضافہ و حذف جیسی غلطیوں کا امکان بڑھ جاتا ہے اس نظریے کو مغربی مورخین میں سے خصوصاً جرمن مستشرق گولڈ زیہر (GOLD ZIHER) ۱۹ اور جے۔ شاخت (J. Schacht) نے اتنے پر زور انداز میں دہرایا کہ صرف مغرب ہی نہیں بعض مسلمان بھی اس پروپگنڈے کی زد میں آگئے اور خود مسلمانوں میں ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے احادیث نبوی کی صحت اور پائیدار استناد پر شک کیا اور خود کو ”اہل قرآن“ کہنے لگے۔

یہ بات تو درست ہے کہ تدوین حدیث کا معاملہ، تدوین قرآن کے معاملہ سے قدرے مختلف ہے۔ قرآن مجید کی تدوین اور تحفظ ایک طرح سے عمل میں آیا۔ اور حدیث کی تدوین اور تحفظ دوسری طرح سے۔ اسی لیے تحقیق اور ثبوت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید (جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے) کو خود رسول اللہ نے اپنی نگرانی میں تحریر کروایا اور اس کے تحفظ کے لیے وہ تدابیر اختیار کیں جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، تاہم رسول اللہ نے اپنی احادیث کی تدوین پر اس درجہ کی توجہ نہ فرمائی۔

اصل میں حدیث کی ایک قسم وہ ہے جس میں سرکاری مراسلے، سیاسی و ثقہ جات، معاہدے، خطوط اور دیگر سرکاری نوعیت کی تحریریں آجاتی ہیں، یہ تحریریں عہد رسالت میں باقاعدہ لکھوائی گئیں۔ ان کے لیے علیحدہ سے کاتبین مقرر تھے۔ یہ ٹھیک ہے

کہ عہد رسالت میں دیوان الانشاء کا باقاعدہ شعبہ قائم نہیں ہوا تھا مگر تمام اہم امور و معاملات تحریری شکل میں انجام پاتے تھے اور ان تحریروں کو محفوظ رکھا جاتا تھا اس کام کے لیے عام کاتبوں کے علاوہ چند مخصوص کتاب مقرر تھے جہشیری نے کتاب الوزراء والکتاب میں عہد رسالت کے کاتبین اور ان کے شعبہ کو یوں بیان کیا ہے۔

☆ علی بن ابی طالب اور عثمان بن عفان وحی کی کتابت کرتے تھے اگر یہ موجود نہ ہوتے تو ابی بن کعب اور زید بن ثابت یہ خدمت انجام دیتے۔

☆ خالد بن سعید بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان، رسول اللہ کے ذاتی ضروریات و حوائج لکھتے تھے۔

☆ مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر عام لوگوں کے قرضہ جات، اور باہمی معاملات اور قضا یا لکھتے تھے۔

☆ عبداللہ بن ارقم بن عبدیغوث اور علاء بن عقبہ، قبائل عرب کے پانی کے چشموں اور انصار کے زن و شوئی کے امور لکھا کرتے تھے۔

☆ زید بن ثابت کتابت وحی کے ساتھ امراء و سلاطین کے نام خطوط اور دعوت نامے لکھتے تھے۔  
☆ معقیب بن ابو فاطمہ، رسول اللہ کے غنائم کے ریکارڈ لکھتے تھے۔

☆ حنظلہ بن ربیع مندرجہ بالا کاتبوں کی عدم موجودگی میں ان کی نیابت کرتے تھے، اسی لیے ان کا لقب 'الکاتب' تھا۔ یہی رسول اللہ کے خاتم بردار بھی تھے۔ ۱۲۔

اس تصریح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر شعبہ کے لیے دو ذمہ دار کاتب مقرر تھے اور ان کی اتقاقیہ غیر موجودگی میں دوسرے کاتب ان کا کام انجام دیتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے شعبہ میں پوری مہارت اور واقفیت رکھتا تھا۔ خلافت راشدہ میں جب باقاعدہ دیوان الانشاء کا قیام عمل میں آیا تو ان ہی حضرات کی خدمات حاصل کی گئیں۔

متقدمین سیرت نگاروں، محدثین، مورخین اور فقہاء نے عہد نبوی کی ان یادگار

تحریروں سے زبردست فائدہ اٹھایا۔ جن کے مستند اور معتبر ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عہد حاضر کے محققین میں سے ڈاکٹر حمید اللہ نے عہد رسالت کی ایسی سرکاری تحریروں کی تلاش و جمع کا کام بڑی عرق ریزی سے کیا اور اس سلسلے میں مغرب کے مختلف ممالک کا سفر کیا جس کے نتیجے میں وہ کم از کم چار سو مکتوبات نبوی کو اپنی شہرہ آفاق کتاب ”سیاسی و شیعہ جات“ میں جمع کر کے شائع کرا چکے ہیں۔ ان چار سو مکتوبات نبوی میں سے کچھ دعوتی خطوط ہیں، کچھ حلینی معاہدے ہیں، کچھ نجی نوعیت کی تحریریں ہیں۔ ۱۳۔

ان سرکاری تحریروں سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تب بھی صحابہ کرام کی بڑی تعداد احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرتی تھی۔ عربوں نے ہمیشہ اپنے حافظہ پر تکیہ کیا ہے، وہ کتابت کے مقابلے میں حفظ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ عہد جاہلیت میں طول طویل قصیدے انہیں حفظ ہوتے تھے، اپنے اور اپنے جانوروں بلکہ دشمنوں تک کے انساب انہیں حفظ ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں اکثریت امی لوگوں کی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے۔ ۱۴ جبکہ یہ قبائلی طرز حیات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے انساب و ایام کو محفوظ رکھیں اور وقت ضرورت دہرائیں، اپنی مفاخرات و منافرات کو محفوظ رکھیں، انہیں شعراء کے کلام بھی حفظ ہوتے تھے، اور اس خصوصیت میں خاص و عام، مرد و عورت بوڑھے بچے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ عرب جاہلیہ کے ہر شاعر کا ایک راویہ ہوتا تھا جو اپنے شاعر کا ہر قول محفوظ کر لیتا تھا اور وقت ضرورت انہیں پڑھتا تھا۔ ۱۵ اسلام آنے کے بعد بھی عربوں کی یہ خاصیت اور صلاحیت باقی رہی۔ ۱۶ اصمعی کہتا ہے میں ابھی بالغ نہ ہوا تھا کہ بدویوں کے بارہ ہزار جزیرہ قصائد کی روایت کر چکا تھا۔ اسی طرح خلف الاحمر جو حماد الراویہ کا شاگرد تھا، لاکھوں کی تعداد میں اشعار سے یاد تھے۔ ۱۷۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا، ان کا یہ عام فقرہ تھا

”حرفٌ فی تامورکٌ خیرٌ من عشرةٍ فی کُتُبک“ یعنی دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے۔

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ۱۸

لِیسِ بِلِعلمِ مَاحَوِی القَمَطِراً

مَا الْعِلْمُ إِلَّا مَا حَوِی الصِّدْرَا

یعنی علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے۔ نہیں ہے علم لیکن صرف وہ جو سینہ میں محفوظ ہو۔

دوسرا شاعر کہتا ہے:

اِسْتَوْدَعَ الْعِلْمَ تَرَساً فَضِيعَةً

وَبِئْسَ مُسْتَوْدَعُ الْعِلْمِ قَرَاطِيسُ

یعنی جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا۔ علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔ ۱۸

اسی مضمون کے متعدد اشعار موجود ہیں جس سے عربوں کی اس قومی خصوصیت اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ کتابت اور حفظ کے متعلق شاید ہی کسی زبان کے ادب میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہوں، عرب معاشرہ کے اس خاص رجحان کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حافظہ زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتا گیا کیونکہ قاعدہ ہے کہ ان نسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ عربوں کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں ورج ہیں، ”کتابی قوموں“ کے لیے ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک بار وہ ایسی مجلس میں تھے جہاں عمر بن ابی ربیعہ آیا، اس نے ستر اشعار پر مبنی ایک طویل قصیدہ پڑھا، شاعر کے جانے کے بعد اسی نشست میں حضرت ابن عباس نے اس طویل قصیدے کے ستر اشعار لوگوں کو سنا دیئے۔ ۱۹

اسی طرح ابن عبدالبر، حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا یہ بیان نقل کرتے ہیں ”میں بقیع کی طرف گذرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کرتا ہوں، اس اندیشہ سے کہ اس میں کوئی فحش بات داخل ہو جائے کیونکہ خدا کی قسم میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی جسے میں بھول گیا ہوں“۔ ۲۰

اسی طرح ابن سعد، امام شعبی کا بیان نقل کرتے ہیں: ”میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی“۔ ۲۱  
عربوں کے اسی غیر معمولی حافظہ کی وجہ سے انا للہ لَجَفِظُونَ کا اعلان قرآن مجید میں آیا ہے اور یہ واقعہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے جب رسول اللہ سے نسیان کی شکایت کی تو آپ کی خاص توجہ اور دعا کی وجہ سے ان کا حافظہ ایسا ہو گیا کہ پھر وہ کوئی بات بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے تقریباً شہرت کے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ ۲۲

الغرض عربوں نے اپنی اسی خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن کو بذریعہ حفظ بھی محفوظ کیا اور بذریعہ کتابت بھی۔ جس کا رسول اللہ نے غیر معمولی اہتمام کرایا۔ حدیث کے بارے میں انہوں نے اس درجہ کا کوئی غیر معمولی اہتمام تو نہیں کرایا لیکن صحابہ کرام نے اپنے طور سے احادیث کو حفظ بھی کیا اور بذریعہ کتابت بھی محفوظ کیا اور یہ سلسلہ عہد رسالت سے شروع ہوا اور تیسری صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے حفاظت حدیث کا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ ذیل میں اس کا ایک جائزہ دیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق (م ۱۳ھ): حضرت ابو بکر صدیق، سابق الاسلام، پہلے خلیفہ راشد کسی تعارف کے محتاج نہیں، انہوں نے رسول اللہ کی کم و بیش پانچ سو احادیث لکھ کر محفوظ کی ہوئی تھیں لیکن انتقال سے ذرا پہلے انہوں نے یہ مسودہ جلادیا تھا، استفسار کرنے پر انہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی بات رسول اللہ سے سننے میں غلطی نہ کی ہو



۲۳۔ اس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔  
 ۲۔ حضرت سعد بن عبادہ (م ۱۵ھ): حضرت سعد بن عبادہ مشہور انصاری صحابی تھے۔ ان کا تعلق بنو خزرج سے تھا اور عرب جاہلیہ میں ”اکامل“ کے لقب سے ملقب تھے۔ اکامل ان افراد کو کہا جاتا تھا جو تیر اندازی، پیرا کی اور کتابت جانتا ہو۔ مدینہ میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ ارباب حل و عقد میں ان کا شمار تھا۔ وہ ان نو خزرجیوں میں شامل تھے جنہوں نے عقبہ کے مقام پر رسول اللہ سے دوسری بار ملاقات کی تھی۔ بیشتر غزوات میں شریک رہے۔ عبداللہ بن ابی کے انتقال کے بعد حضرت سعد خزرجیوں کے سردار بن گئے تھے، رسول اللہ کے انتقال کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں ہونے والے اجلاس میں رسول اللہ کے ممکنہ جانشین کے حوالے سے ان کا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔ ۲۴

حضرت سعد بن عبادہ نے ایک صحیفہ میں احادیث نبوی جمع کی ہوئی تھیں ۲۵، حضرت سعد کے بیٹے اس صحیفہ سے احادیث روایت کیا کرتے تھے امام بخاری اس صحیفہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ صحیفہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی کتاب سے نقل کیا گیا تھا جو اپنے ہاتھ سے احادیث رقم کیا کرتے تھے۔ ۲۶

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ کے ساتھ چھ غزوات میں شریک رہے، غزوہ حنین میں ان کے بازو پر تلوار لگی تھی جس کا نشان باقی رہا۔ آخر وقت میں کوفہ میں آباد ہو گئے تھے ۸۷ھ میں انتقال کیا۔ ۲۷

۳۔ حضرت سمرہ بن جندب (م ۶۰ھ): حضرت سمرہ بن جندب کے بارے میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے ایک صحیفہ میں احادیث جمع کر رکھی تھیں۔ یہ صحیفہ بعد ازاں ان کے بیٹے سلمان کے پاس محفوظ رہا جو اس سے احادیث روایت کیا کرتے تھے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۵ھ): عہد نبوی میں صحابہ کرام کے نوشتوں میں سب سے زیادہ شہرت ”صحیفہ صادقہ“ کو حاصل ہوئی جسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن

العاص نے مرتب کیا تھا۔ آپ فتح مکہ سے تھوڑا عرصہ پہلے اپنے والد (عمرو بن العاص) کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے۔ آپ اپنے والد سے صرف گیارہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے عابد بھی تھے اور طلب علم میں بڑے مستعد بھی۔ انہوں نے رسول اللہ سے بہت زیادہ علم لکھ کر محفوظ کر لیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں یاد کرنے کے خیال سے رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہر بات لکھ لیتا تھا، بعض لوگوں نے مجھے منع کیا کہ تم رسول اللہ سے سن کر ہر بات لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ بھی ایک بشر ہیں کبھی آپ خوش ہوتے ہیں اور کبھی ناراض، یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور رسول اللہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ”لکھا کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اس منہ سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا“۔ ۲۸

حضرت ابو ہریرہ نے بھی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے احادیث لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں ”صحابہ رسول میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس رسول اللہ ﷺ کی احادیث محفوظ نہ تھیں سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا“۔ ۲۹

صحیفہ صادقہ میں ایک ہزار احادیث جمع تھیں۔ ۳۰ اس صحیفہ میں وہ فتوے بھی موجود ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے سوالوں کے جواب میں حضور نے ارشاد فرمائے تھے۔ یہ صحیفہ اب اپنی منفرد حالت میں موجود نہیں تاہم مسند احمد بن حنبل میں روایت ہو کر پورے کا پورا محفوظ ہو گیا ہے۔ ۳۱

۵۔ حضرت ابو ہریرہ (م ۵۸ھ): مشہور صحابی رسول حضرت ابو ہریرہ جو اصحاب صفہ میں شمار ہوتے تھے، ۷ھ میں مدینہ آنے کے بعد ہمہ وقت رسول اللہ کی مصاحبت میں رہتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکیں۔ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے۔ گو رسول اللہ کی توجہ اور دعا سے ان کا حافظہ بہت قوی ہو گیا تھا۔

اور وہ زیادہ تر احادیث حفظ ہی کیا کرتے تھے تاہم ان کے پاس کئی رجسٹر تھے جس میں انہوں نے احادیث لکھ کر بھی محفوظ کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عمرو بن امیہ بیان کرتے ہیں ”ابو ہریرہ کے سامنے ایک حدیث پر گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ہمیں احادیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی ہے“۔ ۳۲

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ ابتداً زمانہ رسالت میں احادیث نہیں لکھتے تھے، رسول اللہ کے وصال کے بعد انہوں نے احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا، اور اس حوالے سے ان کے پاس کئی ضخیم رجسٹریاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک صحیفہ ”الصحیفۃ الصحیفہ“ جسے اب صحیفہ ہمام بن منبہ بھی کہتے ہیں اپنے ایک شاگرد ہمام ابن منبہ کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ تالیف مکمل طور پر محفوظ رہنے کی وجہ سے اب تک حدیث کے دریافت شدہ ابتدائی مجموعوں میں اولیت کا شرف رکھتی ہے۔ ہمام حضرت ابو ہریرہ کے ہم وطن تھے یعنی یمن کے رہنے والے تھے، جب وہ تعلیم کے لیے مدینہ پہنچے تو حضرت ابو ہریرہ کے پاس ٹہرے، جنہوں نے رسول اللہ کی احادیث میں سے ۱۳۸ احادیث کا انتخاب کیا اور ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کر کے ہمام کو لکھوائیں۔ یہ احادیث زیادہ تر تربیت اخلاق سے متعلق ہیں۔ یہ صحیفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی محنت شاقہ سے دریافت ہوا ہے ۳۳ اور یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ حدیث کی تدوین عہد رسالت اور اس سے متصل عہد خلافت راشدہ میں ہو چکی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ کی احادیث کے متعدد نسخے ان کے تلامذہ کے پاس تھے ان میں سعید بن مسیب، عبدالرحمن ابن ہرمز الاعرج، عبدالرحمن بن یعقوب جہنی اور ہمام بن منبہ صنعانی کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عباس (م ۶۸ھ): حبر الامت، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ طبقہ صحابہ میں سیر و مغازی کے مشہور عالم و معلم تھے۔ حضرت ابن عباس حدیث،

فقہ اور تفسیر کے ساتھ بڑے اہتمام سے مغازی اور ایام العرب کا درس دیا کرتے تھے آپ سے دو ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔ ان کی روایات کو دوسرے شاگردوں کے علاوہ کریب نے محفوظ کر لیا تھا۔ امام المغازی موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ کریب نے حضرت عبداللہ بن عباس کی کتابوں میں سے ایک بارشتر کتابیں ہمارے پاس رکھوائی تھیں ۳۴ ان کتابوں کے ذخیرہ میں احادیث بھی تھیں اور سیر و مغازی کا بھی بیان تھا۔

۷۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (م ۷۸ھ): حضرت جابر امام فقیہ اور اپنے زمانے میں مدینہ منورہ کے مفتی تھے یہ آخری بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ جنگ بدر، جنگ خندق اور بیعت رضوان میں شرکت کی۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ یہ آخری صحابی تھے جنہوں نے ۷۸ھ میں وفات پائی اس وقت ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔ آپ نے رسول اللہ سے بہت نافع علم حاصل کیا۔ آپ کے پاس حج کے احکام پر مشتمل ایک مختصر رسالہ تھا۔ ۳۵

ان صحابہ کرام کے علاوہ حضرت علی، حضرت رافع بن خدیج اور حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے نامور صحابہ کے نوشتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں ”میں چند دوسرے صحابہ کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر تھا اور میں ان سب سے کم عمر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص میری طرف جھوٹ منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“ جب لوگ باہر نکلے تو میں نے ان سے کہا رسول اللہ نے حدیث کے بارے میں کتنی شدید وعید فرمائی ہے اور آپ لوگ اس کے باوجود احادیث بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ ہنسے اور کہنے لگے اے بھتیجے، ہم لوگ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا محفوظ ہے۔“ ۳۶

اس جائزہ سے یہ ظاہر ہو گیا کہ حفظ احادیث کے ساتھ ساتھ اسے لکھ کر محفوظ کرنے کا عمل عہد رسالت میں شروع ہو گیا تھا۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہو گئی

کہ بعض احادیث میں لکھنے کی جو مخالفت آئی ہے، وہ بعض مواقع کے ساتھ مخصوص ہے یعنی رسول اللہ نے ان صورتوں میں لکھنے سے منع فرمایا تھا جن میں قرآن و حدیث کے اشتباہ کا احتمال تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد دور صحابہ میں تابعین نے صحابہ کی مرویات کو لکھ کر محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

☆ حضرت ابو ہریرہ جن سے پانچ ہزار تین سو چوہتر احادیث مروی ہیں ان کے بے شمار شاگردوں نے ان احادیث کو لکھ کر محفوظ کیا اور یہ سلسلہ روایت آگے بڑھا، چنانچہ مسند دارمی میں ہے کہ آپ کے شاگردوں میں سے بشیر بن نہیک نے آپ کی روایات کو لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

☆ حضرت عبداللہ بن عباس سے دو ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں، ان کی روایات کو دوسرے شاگردوں کے علاوہ کریب نے محفوظ کر لیا تھا۔

☆ حضرت انس جو کہ دو ہزار دو سو چھیالیس احادیث کے راوی ہیں ان کی مرویات کو ابان نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

☆ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ جو دو ہزار دو سو دس احادیث کی روایت کرتی ہیں ان کی احادیث کو عروہ بن زبیر نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمر جو ایک ہزار چھ سو تیس احادیث کی روایت کرتے ہیں ان کی روایات کو نافع نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

☆ اور حضرت جابر بن عبداللہ انصاری جو ایک ہزار پانچ سو چالیس احادیث کے راوی ہیں ان کی مرویات کو قتادہ بن دعامہ سدوسی نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

اس طرح سے دور صحابہ و تابعین میں بیشتر احادیث ضبط تحریر میں آگئیں۔ ان میں کوئی نظم اور ترتیب نہیں تھی یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) آیا تو انہوں نے احادیث نبوی کو محفوظ کرنے کا حکم دیا۔ اسی سلسلہ میں آپ

نے مدینہ کے قاضی حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری کو فرمان بھیجا کہ ”رسول اللہ کی جو حدیثیں ہیں انہیں تلاش کر کے مجھے لکھ بھیجو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف ہے“ ۳۹۔

اس طرح احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مدینہ کے علم العلماء ابن شہاب زہری نے ان احادیث کو ترتیب دی اور تہذیب سے منظم و منضبط کیا نیز اسناد کے ساتھ بیان کرنے کی بھی ابتداء کی۔ اسی وجہ سے ان کو علم اسناد کا وضع کہا جاتا ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں دوسری صدی ہجری میں احادیث کے متعدد اہم مجموعے منظر عام پر آئے۔ تفصیلات سے بچتے ہوئے چند اہم مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ کتاب الآثار: امام ابو حنیفہ نے (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ / ۶۹۹ء تا ۷۶۷ء) جن کی فقہی خدمات سے ساری اسلامی دنیا واقف ہے، احادیث احکام میں سے صحیح روایات کا انتخاب کر کے ایک مستقل تصنیف میں ان کو ابواب فقہ پر مرتب کیا اور اس کا نام ”کتاب الآثار“ رکھا۔ مولانا عبدالرشید نعمانی اس صحیفہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ”آج امت کے پاس احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم ترین کتاب یہی ہے، جو دوسری صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے“۔ ۴۰

امام ابو حنیفہ سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے صحیفے اور مجموعے تھے وہ فنی ترتیب سے محروم تھے۔ جامعین حدیث نے ان تمام احادیث کو قلم بند کر دیا جو انہیں یاد تھیں، البتہ امام شعبی نے بعض مضامین کی احادیث عنوان وار جمع کی تھیں، لیکن ان کی یہ کوشش چند ابواب تک محدود رہی۔ امام ابو حنیفہ نے پہلی دفعہ احادیث کو باقاعدہ کتب و ابواب پر پوری طرح مرتب کرنے کا ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو بعد کے آئمہ کے لیے ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں ایک اعلیٰ نمونہ بنا۔ ۴۱

’کتاب الآثار‘، ’موطا‘ سے پہلے کی تالیف ہے اور امام مالک نے موطاء مرتب

کرتے وقت اس سے استفادہ کیا تھا۔ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث احکام تھیں۔ یعنی وہ احادیث جن سے مسائل فقہ کا استنباط ہوتا ہے۔ موطاء اور دیگر کتب احادیث کی طرح ”کتاب الآثار“ کے بھی متعدد نسخے ملتے ہیں جن کے راوی امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام زفر بن ہذیل، امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، امام حسن بن زیاد لولوی اور امام ابو حنیفہ کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ شامل ہیں۔ ۴۲

امام ابو یوسف سے روایت کردہ ”کتاب الآثار“ ۱۳۵۵ھ میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی کی مرتبہ ”کتاب الآثار“ کا اردو ترجمہ ہو گیا ہے اور کراچی سے چھپ گئی ہے۔ ۴۳

۲۔ موطاء: زیر نظر عہد میں احادیث کا دوسرا اہم مجموعہ امام مالک بن انس (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ) کی تالیف ”موطاء“ ہے جو اہل مدینہ کی روایات اور فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب چالیس سالہ محنت اور غور فکر کے بعد ۱۴۳ھ میں مدون ہوئی اس کتاب کی تدوین کے وقت ان کے پیش نظر دس ہزار احادیث کا ذخیرہ تھا جس میں سے آپ نے صرف ایک ہزار سات سو بیس حدیثیں منتخب کیں۔ موطاء کی تالیف کا محرک خلیفہ منصور عباسی ہے۔ جس نے امام مالک سے درخواست کی تھی کہ جو احادیث ان کے نزدیک صحیح ہوں انہیں ایک کتاب میں یکجا کر دیا جائے لہذا امام مالک نے یہ کتاب مدون کی۔ امام مالک کی اس کتاب کو ان کے ایک ہزار سے زائد شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ تاہم زیادہ مقبول نسخے یحییٰ بن یحییٰ لیشی مسمودی، مدینہ کے قاضی ابن مصعب احمد بن ابی بکر، امام ابو حنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن شیبانی، ابن بکیر اور ابن وہب کے نسخہ جات کا ذکر عام ملتا ہے۔ بعض علماء صحاح ستہ میں موطاء کو بھی شامل کرتے ہیں جبکہ بعض علماء اسے حدیث سے زیادہ فقہ کی کتاب مانتے ہیں۔

۳۔ دوسری صدی ہجری کی دیگر کتب احادیث: دوسری صدی میں بڑے بڑے علماء

ومحدثین، احادیث کے مجموعے مرتب کر رہے تھے اور یہ کام مملکت اسلامیہ کے طول و عرض میں ہو رہا تھا چنانچہ حضرت ابن جریج نے مکہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، حضرت سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں حدیث کی کتاب ”جامع سفیان ثوری“ مرتب کی۔ حضرت ابوسلمہ (م ۱۶۷ھ) نے ”مصنف ابی سلمہ“ مرتب کی ان کا تعلق بصرہ سے تھا۔ ابی سفیان نے (م ۱۹۷ھ) ”مصنف ابی سفیان“، سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) نے ”جامع سفیان“ مرتب کیں، نیز حضرت ہیشم نے واسط میں، حضرت معمر نے یمن میں، حضرت ابن مبارک نے خراسان میں، حضرت جریر نے رے میں احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔

۳۔ تیسری صدی ہجری کی کتب احادیث: تیسری صدی ہجری تک آتے آتے علم حدیث اپنے کمال کو پہنچ رہا تھا۔ اس صدی کے آغاز میں ہی امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کی ”کتاب الام“ اور امام احمد ابن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی مسند احمد ابن حنبل مدون ہوئیں۔ آخر الذکر کتاب احادیث نبوی کا سب سے بڑا مجموعہ تھا۔ اس میں چالیس ہزار احادیث شامل ہیں۔ دس ہزار مکرر ہیں۔ اس کے بعد ”صحاح ستہ“ کی تدوین کا مرحلہ آیا۔ صحاح ستہ حدیث کی ان چھ کتابوں کو کہا جاتا ہے جو اپنے مولفین کے نام سے مشہور ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری، اپنے مولف امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۲ھ) کے مجموعہ حدیث کا نام ہے۔ امام بخاری نے اپنے مجموعہ میں صرف انہی احادیث کو جگہ دی ہے جو صحیح اور متصل سند کے ساتھ رسول کریمؐ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے رواۃ و رجال ضبط و عدالت کی صفات کے حامل ہیں۔ صحیح احادیث کا یہ کڑا انتخاب ہے۔ جمہور علماء اسے قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب کا درجہ دیتے ہیں۔

۲۔ صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری (۲۰۴ھ تا ۲۶۱ھ) کی مرتبہ کتاب ”صحیح مسلم“ کے نام سے معروف ہے۔ صحیح بخاری کے بعد صحت کے اعتبار سے مشہور ترین تالیف ہے۔ اسے امام موصوف نے پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد تین لاکھ روایات



میں سے بارہ ہزار احادیث کا انتخاب کر کے مرتب کیا یہ تعداد طرق و اسانید کی ہے، متون کی نہیں، لہذا اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو صحیح مسلم کی کل احادیث کی تعداد چار ہزار کے قریب ہوتی ہے۔

۳۔ سنن ابو داود، کو امام داود سلیمان بن اشعث بن اسحاق اسدی بختانی (۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ) نے پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کر کے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں کل چار ہزار آٹھ سو احادیث ہیں اور سب کی سب احکام پر مشتمل ہیں۔ ابو داود نے ”سنن“ کو اپنی جوانی ہی میں مرتب کر لیا تھا اس وقت ان کے استاد امام احمد ابن حنبل ابھی زندہ تھے اور انہوں نے اس کتاب کی بڑی توصیف کی۔

۴۔ سنن نسائی، کے مولف امام ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی (۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ) ہیں۔ امام نسائی کے پیش نظر پانچ لاکھ احادیث تھیں جن میں سے پانچ ہزار سات سو اکٹھ صحیح روایات کو الگ کر کے سنن نسائی مرتب کی۔ سنن نسائی کی اکثر احادیث، دوسری کتب صحاح میں بھی موجود ہیں۔

۵۔ جامع ترمذی، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ) کی جامع ترمذی کو جامع بھی کہا جاتا ہے اور سنن بھی۔ سنن اصطلاح حدیث میں اس کتاب حدیث کو کہا جاتا ہے جس کی ترتیب ابواب فقہ کے طرز پر کی گئی ہو۔ امام ترمذی نے اس میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل کی ہیں۔ ہر ضعیف حدیث کے وجہ ضعیف پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور ہر حدیث کے ساتھ اس کا درجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ صحت احادیث اور قوت کے اعتبار سے جامع ترمذی کا مرتبہ کتب صحاح میں پانچویں درجہ پر ہے۔

۶۔ سنن ابن ماجہ، امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ اتفرونی (۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ) تالیف سنن ابن ماجہ بھی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کتاب کو پانچویں صدی ہجری تا اواخر میں صحاح ستہ میں شمار کیا گیا، وگرنہ اس سے پہلے محدثین نے صرف پانچ

بخاری، مسلم، نسائی، ابو داود اور ترمذی ہی کو مستند کتب حدیث قرار دیا تھا۔ سنن ابن ماجہ حسن ترتیب کے اعتبار سے ممتاز ہے، اس میں مکررات بھی نہیں ہیں۔ اس میں تقریباً چار ہزار احادیث ہیں۔

## حواشی و حوالہ جات (باب دوم، فصل دوم)

۱۔ حمید اللہ، خطبات بہاولپور، ص ۳۷۔

۲۔ مصطفیٰ سبائی 'حدیث رسول کا تشریحی مقام' مترجم غلام احمد حریری، ص ۹۱ (فیصل آباد، ۲۰۰۶ء)۔

۳۔ ایضاً (بحوالہ الرسالة للشافعی، ص ۷۸)

۴۔ خطبات بہاولپور، ص ۳۶۔

۵۔ اسی طرح کی مزید آیات کے لیے رجوع کیجئے۔ (الانفال۔ ۲۳) (النساء۔ ۸۰) (آل عمران۔ ۳۱) (آل عمران۔ ۳۲) (النور۔ ۶۳) وغیرہ۔

۶۔ گیلانی، مناظر احسن تدوین حدیث، ص ۷۲ (بحوالہ صحاح)۔

۷۔ ایضاً (بحوالہ ابو داؤد، مستدرک)۔

۸۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۹۔ Ignaz God Ziher قومیت کے لحاظ سے ہنگرین اور مذہباً یہودی تھا۔ ۱۸۵۰ء

میں پیدا ہوا۔ یورپ میں اسلامی علوم کے مطالعہ کی تحریک میں خاصا سرگرم تھا۔ اس نے

عربی زبان پر عبور حاصل کیا اور حدیث نبوی کے مطالعہ پر توجہ مرکوز رکھی۔ جرمن یونیورسٹی

لاپزنگ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، کچھ عرصہ جامعہ الازہر سے بھی وابستہ رہا اس کی سب

سے مشہور کتاب Mohamman Studies ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے

جرمن زبان میں لکھی جانے والی اس کتاب میں حدیث نبوی کی جمع و تدوین کے علاوہ وضع

حدیث کے اسباب و محرکات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور اس طرح کے اعتراضات

اٹھائے ہیں کہ پڑھنے والا حدیث کے پورے ذخیرے ہی سے بدظن ہو جاتا ہے۔ گولڈ

زیہر کو۔ ج اور ویانا کی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹری کی اعزازی ڈگریاں دیں اور دنیا کی

بہت سی علمی مجالس نے اسے اعزازی رکنیت دی۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا (شیخ عنایت اللہ

”گولت زہیر“ مشمولہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۷، ص ۵۷۶۔

۱۰۔ پروفیسر جے۔ شاخت Joseph Schacht بیسویں صدی کا مشہور جرمن مستشرق جس نے اسلامی فقہ اور تاریخ اصول فقہ کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا۔ برسلاو اور ہائیزگ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کونٹس برگ اور قاہرہ کی جامعات میں پڑھاتا رہا۔ چند سال آکسفورڈ یونیورسٹی میں ریڈر کے عہدے پر مامور رہا بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں لائڈن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ چار سال بعد نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ قبول کیا اور اپنی وفات ۱۹۶۹ء تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہا۔ پروفیسر شاخت نے متعدد عربی کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ شاخت کی دو تصانیف The origin of Mohammanan Jurisprudence اور Introduction to Islamic Law خاص طور پر قابل ذکر ہیں (شیخ عنایت اللہ ”شاخت“ مشمولہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۱، ص ۵۶۰، دانشگاه پنجاب، لاہور)۔

۱۱۔ حمید اللہ، خطبات بہاولپور، ص ۳۶۔

۱۲۔ اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۱۱۰ (بحوالہ جہشیاری، محمد بن عبدوس کتاب الوزراء والکتاب ورق ۶۔ ب بعنوان اسماء من ثبت علی کتابہ رسول اللہ ﷺ طبع دنیا)۔

۱۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے مجموعہ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافة راشدہ، قاہرہ ۱۹۳۱ء۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ یحییٰ نوشہروی نے کیا اور کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔

۱۴۔ آلوسی، شکرى محمود بلوغ الارب جلد ۱، ص ۷۳ (مترجم ڈاکٹر پیر محمد حسن)۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ عبد الملک بن قریب الاصمعی، عربی زبان کا مشہور لغت دان، اس کی متعدد تصانیف ہیں، تقریباً ۲۳۱ھ میں وفات پائی۔

۱۷۔ خلف الاحمر کے لیے کہا جاتا ہے کہ لامیہ قصیدہ جو شفرئی کی طرف منسوب ہے دراصل اسی کا لکھا ہوا ہے۔ تقریباً ۱۸۴ھ میں وفات ہوئی (بلوغ الارب، جلد ۱، ص ۷۵)۔  
 ۱۸۔ اس مضمون کے مزید اشعار مناظر احسن گیلانی کی 'تدوین حدیث'، ص ۱۰۳-۱۰۴ میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۹۔ گیلانی، سید مناظر احسن 'تدوین حدیث'، ص ۱۰۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ الذہبی اس واقعہ کو درست نہیں مانتے۔ دیکھئے 'تذکرہ الحفاظ' جلد ۱، ص ۵۔

۲۴۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۱، ص ۳۱-۳۲۔  
 دانشگاہ پنجاب، لاہور، طبع اول ۱۹۷۵ء۔

۲۵۔ ترمذی، امام 'سنن ترمذی' کتاب الاحکام، باب الیمین مع الشاہد۔

۲۶۔ امام بخاری 'جامع الصحیح' کتاب الجہاد، باب الصبر علی القتال۔

۲۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۴۱۔

۲۸۔ امام ابو داؤد، سلیمان بن اشعث (م ۲۵۷ھ) 'سنن ابی داؤد'، ص ۵۱۳-۵۱۴ (مطبع ولی محمد اینڈ سنز، کراچی)۔

۲۹۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) 'صحیح بخاری' جلد ۱، ص ۲۲ (نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۱ھ)۔

۳۰۔ ابن اثیر، 'اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ' جلد ۳، ص ۲۳۳۔

۳۱۔ امام احمد ابن حنبل 'مسند احمد' جلد ۲، ص ۱۵۸ تا ۲۲۶۔

۳۲۔ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) 'مقدمہ فتح الباری' جلد ۱، ص ۲۱۷ (مصر، ت ن)۔

۳۳۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے ڈاکٹر زینب افتخار کا غیر مطبوعہ پی ایچ۔ ڈی مقالہ 'ڈاکٹر حمید اللہ کی تاریخ نویسی، باب سوم، فصل دوم مخزنونہ نگار سجاد ظہیر۔

۳۴۔ ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۵، ص ۲۹۳۔

۳۵۔ ذہبی، امام ابو عبد اللہ محمد 'تذکرۃ الحفاظ' (مترجم حافظ محمد اسحاق) جلد ۱، ص ۵۵ (اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور ۱۹۸۱ء)۔

۳۶۔ لہیثمی، نور الدین علی بن ابی بکر (م ۸۰۷ھ) 'مجمع الزوائد، جلد ۱، ص ۱۵۲ (دارالکتب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)۔

۳۷۔ محمد بن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۷، ص ۷۲ (دارصادر، بیروت، ۱۳۸۸ھ)۔

۳۸۔ سیوطی، علامہ جلال الدین (م ۹۱۱ھ) 'تدریب الراوی، ص ۷۳ (مکتبہ علمیہ، مدینہ منورہ، ۱۳۹۲ھ)۔

۳۹۔ شبلی مقدمہ، ص ۲۱-۲۰

۴۰۔ نعمانی، محمد عبدالرشید 'امام ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۱۵۹۔

۴۱۔ ایضاً۔

۴۲۔ انور محمود خالد 'اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۶۳ (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۹ء)۔

## سیرت نگاری کا آغاز (دور اول)

حدیث ہی کی طرح سیرت نگاری کا آغاز بھی مدینہ منورہ سے ہوا آگے چل کر جب یہ فن عراق میں بھی پھیلا تو اپنے رجحانات کے حوالے سے سیرت و تاریخ نگاری کے باقاعدہ دو دبستان بن گئے۔ پہلا دبستان مدینہ تھا جو بنیادی طور پر اسلامی فکر کا ترجمان اور رسول اللہ کی سیرت اور اسلام کی ابتدائی تاریخ کے ساتھ مخصوص تھا۔ دوسرا دبستان عراق (کوفہ، بصرہ، بغداد) تھا جو قبائلی زندگی اور تاریخی مطالعات کے دیگر مختلف پہلوؤں سے متعلق تھا۔

## سیرت نگاری کا دبستان اول مدینہ منورہ

مدینہ وہ شہر تھا جو رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت گاہ تھا۔ یہی وہ شہر تھا جس نے اسلام کو پناہ دی اور پرہان چڑھایا سارے اسلامی علوم پہلے پہل مدینہ ہی میں پروان چڑھے۔ یہاں صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین کی بہت بڑی تعداد آباد تھی، جنہوں نے علوم القرآن اور حدیث و مغازی کے حوالے سے بہت کام کیا۔ مدنی اسکول پر حدیث اور روایت کے خاص اثرات پڑے۔ یہ ”تدقیق“ اور ”محافظة“ کے لیے معروف ہوا۔ اس مرکز میں روایات کی محافظت، حکومت کے شام منتقل ہو جانے کے بعد بھی رہی۔ وہ قریش کے طبقہ اشراف کا صرف گہوارہ ہی نہیں تھا بلکہ ثقافت اسلامیہ کا مرکز بنا رہا، یہاں تک کہ اس کی علمی قیادت کا خاتمہ بغداد نے کیا چنانچہ بغداد نے سیرت اور مغازی پر

جو خاص مدینے کے فنون تھے اور پھر حدیث پر بھی اپنا قبضہ جمالیا۔  
 علم السیرة کا مدینہ میں فروغ پانا طبعی تقاضا تھا کیونکہ یہ دعوت اسلامیہ کا وطن  
 اصلی رہا ہے اور یہیں سے اسلام پھیلا۔ اس لیے سیرة نے بھی مدنی لباس پہن لیا اور ان  
 خصوصیات کی حامل ہو گئی جو اہل حجاز سے منسوب ہیں، یعنی حدیث کی طرف ان کا  
 میلان۔ اور نقد سے زیادہ روایت پر زور۔ عباسی عہد کے آغاز میں مدنی علمائے سیرة کے  
 حریف پیدا ہونے لگے یہ لوگ نہ صرف بغداد، بصرہ اور کوفہ میں تھے بلکہ مصر میں بھی  
 تھے۔ یہ طبقہ ہر چند سیرة ابن اسحاق سے متاثر تھا جو اہل مدینہ کے میلان کی نمائندہ ہے  
 لیکن عراقی رجحان نے بہت جلد فوقیت حاصل کر لی جو نقد، ایجاد اور عقلیت پسندی کی  
 طرف مائل تھا اور جہاں ان روایات ماثورہ کی چھان پھٹک عقل کی چھلنی میں کی جاتی تھی  
 جو اہل مدینہ کی کتابوں میں پائی جاتی تھیں۔ ۲

## سیرت و مغازی تدوین سے قبل

جن اسلامی علوم و فنون کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوئی، ان میں حدیث اور فقہ  
 کی طرح سیر و مغازی کا علم بھی شامل ہے۔ اور ایسا ہونا بڑا فطری تھا کیونکہ مدینہ میں ہی  
 جہاد فرض ہوا، یہیں سے غزوات و سرایا کی مہمات روانہ ہوتی تھیں اور یہیں واپس آتی  
 تھیں، یہ ہزاروں صحابہ مدینہ ہی میں مقیم ہوتے تھے اور سیر و مغازی کے واقعات بیان  
 کرتے تھے۔

عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں صحابہ کی تعداد ہزار ہا تھی۔ غزوہ تبوک، جو عہد  
 رسالت کا آخری غزوہ تھا اس کے شرکاء کی تعداد کا اندازہ تیس ہزار لگایا گیا ہے ۳۔ ایک  
 اندازہ کے مطابق جب رسول اللہ نے انتقال فرمایا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام  
 مملکت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے وصال نبوی کے وقت عین  
 مدینہ منورہ میں تیس ہزار صحابہ موجود تھے۔ ۴



ان ہی حضرات نے مدینہ میں سیر و مغازی کی روایت کی، اور غزوات و سرایا کی کیفیات و واقعات بیان کئے۔ بیشتر اصحاب حدیث بیان کرنے میں محتاط تاہم جنگوں کے واقعات کی روایت کرنے میں سہولت محسوس کرتے تھے۔ کچھ حضرات خاص خاص واقعات کی روایت کرتے تھے، اور لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر خاص طور سے یہ واقعات سنا کرتے تھے۔ حضرت صہیب بن سنان رومی، جو تقریباً تمام غزوات میں رسول اللہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے، جب لوگ ان سے حدیث کے بارے میں سوال کرتے تو وہ کہا کرتے۔ ”میں رسول اللہ کی حدیث بیان نہیں کروں گا البتہ اگر تم لوگ چاہو تو آپ کے غزوات اور اسفار بیان کروں۔“ ۵

بہت سے صحابہ غزوات میں اپنے اور دوسروں کے خاص خاص واقعات بیان کیا کرتے تھے مثلاً طلحہ بن عبید اللہ غزوہ احد کے واقعات بیان کرتے تھے۔ ۶ حضرت عبدالرحمن ابن عوف، غزوہ بدر میں معاذ اور معوذ کے ہاتھوں ابو جہل کی بلاکت کا واقعہ نہایت اچھے انداز سے روایت کرتے تھے۔ اور اس واقعہ کے خاص راوی تھے یہاں تک کہ ان کی اولاد اس واقعہ کو خاندانی روایت کے طور پر بیان کرتی تھی اور اہل علم اس کو لکھتے تھے۔ ۷

جنگوں سے ہٹ کر دیگر واقعات کی روایت بھی بعض اوقات خاص خاص اصحاب ہی کرتے تھے، باقی سب ان سے سمع کرنے جاتے تھے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ سے واقعہ افک کی طویل روایت کو سن کر نقل کرنے والوں میں ان کے بھانجے عروہ بن زبیر، سعید بن مسہب، علقمہ بن وقاص، اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے کی ہے۔ ۸

حضرت عقیل بن ابوطالب قبیلہ قریش کے انساب و ایام العرب کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ لوگ ان سے مسجد نبوی میں اس کی تعلیم حاصل کرتے تھے

اور وہ نہایت اہتمام سے تکیہ لگائے ہوئے لوگوں کو معلومات فراہم کرتے تھے۔ ان کے حال میں لکھا ہے۔ ”وہ قریش کے سب سے بڑے عالم انساب اور قریش کی جنگوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ مسجد نبوی میں ان کے لیے خاص طور سے تکیہ رکھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پاس جمع ہو کر نسب اور ایام العرب کا علم حاصل کرتے تھے۔“ ۹

مدینہ میں حضرت عروہ بن زبیر کی مستقل درسگاہ ”کتابِ عروہ“ کے نام سے مشہور تھی، اسی میں وہ درس دیا کرتے تھے، یہ درسگاہ مسجد نبوی کے باب السلام اور مصلیٰ (مسجد غمامہ) کے درمیان مسجد بنی زریق کے قریب واقع تھی، اس علاقہ میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبدالرحمن بن حارث کے مکانات تھے اور حضرت عبدالرحمن بن حارث کے مکان کی ایک کھڑکی ”کتابِ عروہ“ کی طرف کھلتی تھی۔ ۱۰

مدینہ میں مغازی کی مشہور درسگاہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی مجلس درس تھی۔ اس میں علم المغازی پر درس کا دن مقرر تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس اپنی مجلس درس میں ایک دن صرف فقہ، ایک دن تفسیر، ایک دن مغازی ایک دن شاعری اور ایک دن صرف ایام العرب بیان کرتے تھے۔ لوگ اپنی پسند اور ضرورت کے اعتبار سے ان مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ سیر اعلام النبلاء کی ایک روایت جو قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی کتاب تدوین سیر و مغازی میں بیان کی ہے ۱۱۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبداللہ بن عباس کی یہ علمی مجلس عموماً شام میں منعقد ہوا کرتی تھیں، شاید اس لیے کہ دن میں لوگ امور معیشت میں مصروف ہوتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص اپنے لڑکوں کو مغازی کی تعلیم دے کر غزوات میں ثابت قدمی، بہادری اور جوانمردی کی دعائیں یاد کراتے تھے اور اسلامی غزوات کو آبائی شرف بتا کر ان کو یاد رکھنے کی تلقین فرماتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے محمد بن سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے ”ہمارے والد ہم لوگوں کو مغازی اور سرایا کی تعلیم دیتے تھے اور کہتے

تھے کہ اے بیٹو یہ تمہارے آباء اجداد کا شرف ہیں۔ تم لوگ ان کو یاد رکھو، ضائع نہ کرو۔“ ۱۲۔  
الغرض مغازی کی اہمیت کے پیش نظر ان کی تعلیم و تدریس کے لیے مستقل  
مجلسیں اور مخصوص حلقہ درس قائم ہوتے تھے، جن میں صرف سیر و مغازی کا بیان ہوتا تھا۔  
امام محمد بن شہاب زہری علم المغازی کو ”خیر الدنیا و الآخرة“ کہا کرتے تھے اس لیے  
سیر و مغازی کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور ان واقعات کو لوگ حفظ بھی کرتے،  
حصول معلومات کے لیے متعلقہ علماء سے سوالات بھی کرتے اور بغرض تحقیق بعض اوقات  
اس کے لیے سفر بھی کرتے۔

حضرت علی کے پانچ سالہ دور کو چھوڑ کر خلافت راشدہ کا تمام زمانہ اور بنو امیہ  
کا تقریباً پورا دور اسلامی فتوحات کا شاندار دور ہے، جب جہاد کی گرم بازاری تھی، اور  
اسلام کا پیغام مشرق و مغرب میں پہنچایا جا رہا تھا۔ ان جنگوں میں صحابہ کرام کی کثیر تعداد  
شریک ہوتی تھی جو میدان جنگ میں موقع محل کے اعتبار سے رسول اللہ کے مغازی کے  
واقعات اور سیر کے اصول و احکام بیان کیا کرتے تھے۔ اس طرح مدینہ کے اندر ہی نہیں  
مملکت کے طول و عرض میں سیر و مغازی کے تذکرے پھلتے چلے گئے، چنانچہ عہد نبوی کے  
غزوات و سرایا میں شرکت کرنے والے صحابہ بعد میں یا بغرض جہاد یا بغرض تعلیم مفتوحہ  
ممالک میں پھیل گئے اور اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے حلقہ درس میں دینی علوم کے  
ساتھ سیرت و مغازی کو بھی بیان کرنے لگے۔

مدینہ منورہ کی معاشرتی و علمی زندگی کا یہ بڑا تانباک پہلو ہے کہ وہاں انصار و  
مہاجرین، ان کی اولاد اور اعیان و اشراف کی مجلسیں پاپا ہوا کرتی تھیں۔ بہت سے اہل علم  
کی انفرادی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مختلف موضوعات پر دینی و علمی مذاکرے ہوتے  
تھے۔ ان میں سیرت اور مغازی کے بھی تذکرے ہوتے تھے۔ فن مغازی کے حوالے سے  
جن جلیل القدر علماء کی محفلیں جمتی تھیں ان میں عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ)، ابان بن عثمان

(م ۱۰۵ھ) عاصم بن عمر بن قتادہ (م ۱۲۰ھ)، محمد بن مسلم بن شہات زہری (م ۱۲۳ھ)، شریک بن سعد (م ۱۲۳ھ)، عبد الملک بن ابوبکر بن حزم انصاری (م ۱۵۱ھ) اور عبد اللہ بن جعفر (م ۱۷۰ھ) کے نام اہم ہیں۔ یہ ہمعصر و ہموطن علمائے سیر و مغازی یکجا بیٹھ کر مذاکرے کرتے، اور سننے والے اپنے اپنے ظرف، حوصلہ اور ذوق کے مطابق حصہ لیتے، مروان بن حکم اپنے دور امارت میں مدینہ منورہ کے علمائے صحابہ و تابعین کی مجالس منعقد کر کے ان سے استفادہ کرتا تھا، اور ان سے امور مملکت کے بارے میں مشورہ کر کے ان کے فیصلے پر عمل کرتا تھا۔ ۱۳

ان فکری مجالس میں مدینہ منورہ کی ”مجلس القلادہ“ بہت مشہور تھی جس میں عبد اللہ بن عباس، عبید اللہ بن عدی بن خیار، عبدالرحمن بن عبد اللہ بن ابوربیعہ مخزومی، ابویسار بن عبدالرحمن ابن عبید اللہ، موسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ، عبدالرحمن بن عبدقاری جیسے پایہ کے صحابہ و تابعین اس مجلس میں شریک ہوتے تھے، اسی لیے اس کا نام ”مجلس القلادہ“ تھا۔ یہ مجلس روز آٹھ رات کو منعقد ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں حضرت معاویہ بھی اس کے رکن تھے۔ جب وہ شام چلے گئے تو مدینہ سے آنے والوں سے مجلس القلادہ کے بارے میں خاص طور پر پوچھا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ”جب تک مجلس قلادہ قائم رہے گی، مدینہ آباد رہے گا“ ۱۴ مروان بن حکم کے دور امارت کے دوران ایک ناگوار واقعہ کے بعد یہ مجلس ہمیشہ کے لیے بند گئی۔ ۱۵

مجلس قلادہ کی طرح مدینہ کے قریب وادی عقیق میں ایک مجلس، قصر اسحاق بن ایوب مخزومی میں منعقد ہوتی تھی اس میں مدینہ اور وادی عقیق کے اہل علم و فضل اور ارباب مجد و شرف جمع ہو کر مختلف موضوعات پر کھل کر بحث و مباحثہ کرتے تھے، ان میں منذر بن عبد اللہ بن منذر قرشی اسدی، عمران بن موسیٰ بن عمران، محمد بن طلحہ بن عمیر، صالح بن محمد بن مسور، مفتی بن عبد اللہ بن عنبہ، عبد الجبید بن علی لیشی، محمد بن صالح ازرق

بزار مولیٰ بن فہر شریک ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ مجلس کئی کئی دنوں تک قائم رہتی تھی، اس میں دیگر مباحث و موضوعات کی طرح موقع محل کی مناسبت سے سیر و مغازی پر بھی مذاکرہ ہوتا تھا۔ ۱۶

مردوں کی محافل و مجالس کے علاوہ خواتین بھی ان علمی سرگرمیوں میں پیچھے نہیں تھیں وہ بھی سیر و مغازی کے تذکرے اور اس بارے میں بحث و تحقیق میں حصہ لیتی تھیں ابتداء میں عورتوں کو غزوات میں شرکت کی اجازت نہیں تھی، قبیلہ بنو قضاء کی ایک صحابیہ حضرت ام کبشہ نے رسول اللہ سے غزوہ میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا ”تم بیٹھ جاؤ، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد عورت کو لے کر جنگ کرتے ہیں۔“ ۱۷ اس لیے ابتدائی غزوات میں صحابیات کی شرکت نہیں ہو سکی، مگر غلبہ اسلام کے بعد ان کو اس کی اجازت مل گئی اور عورتیں جہاد میں عام طور سے زخمیوں اور مریضوں کی خدمت کرتی تھیں، پانی پلاتی تھیں۔ بعض صحابیات نے جہاد میں حصہ لے کر بہادرانہ خدمات انجام دیں، ان مجاہدات و غازیات نے بعد میں اپنے واقعات بیان کئے، ان کی تحقیق کی، ان سے سوالات کئے گئے اور جب سیر و مغازی کی تدوین کا دور آیا تو ان کی روایات سے کام لیا گیا۔ حضرت امیہ بنت قیس غفاریہ، جو غزوہ خیبر میں شریک تھیں، اس کے واقعات بیان کرتی تھیں، اسی طرح حضرت ام عمارہ نسیبہ بنت کعب بن عمرو غزوہ احد میں شریک تھیں، زخم بھی کھائے تھے، وہ اس کے واقعات بیان کرتی تھیں اسی طرح سے سیدہ عائشہ صدیقہ کا حجرہ مبارک متصل مسجد نبوی بذات خود ایک بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں سے اکابرین نے علم حاصل کیا، حضرت عائشہ کے دو سو سے زائد شاگردوں میں اڑتیس خواتین تھیں۔ ۱۸

المختصر بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب مدینہ منورہ میں اسلام پھیلا تو گھر گھر تفسیر، حدیث، فقہ اور مغازی کے چرچے ہونے لگے۔ مسجد نبوی میں اس حوالے

سے حلقہ ہائے درس قائم تھے، نجی محافل و مجالس میں بھی علوم دینیہ کا چرچا تھا مدینہ چونکہ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا مرکز بھی تھا اور عہد رسالت و خلافت راشدہ میں (حضرت علی کے دور کو چھوڑ کر) یہیں سے جنگوں کے لیے فوجیں روانہ ہوتی تھیں، بعض اوقات یہیں واپسی ہوتی تھی، غنائم مدینہ ہی لائے جاتے تھے، اکناف عالم میں سیاسی احکامات اور دینی فتوؤں کا اجراء یہیں سے ہوتا تھا لہذا مدینہ اس دور میں علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور رہا۔ اسی دور میں اہل مدینہ کی معاشرتی زندگی میں ایک تبدیلی اور آئی اور وہ یہ کہ فتوحات کی کثرت کی وجہ سے، غنائم میں کثرت ہوئی، جس کی وجہ سے عام شہریوں تک خوشحالی در آئی، اور مدینہ میں فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا۔ معاشی استحکام، علمی مشاغل میں اضافے کا باعث بنتا ہے، لہذا مدینہ سے متصل، وسیع و عریض وادی عقیق میں صحابہ کی بعض اولادوں نے قصر اور محلات تعمیر کرائے تھے، انہی میں عروہ بن زبیر کے محلات بھی تھے ۱۹ء، جہاں علمی، ادبی اور شعری محافل منعقد ہوا کرتی تھیں حضرت علی اور اموی دور میں اگرچہ مسلمانوں کا سیاسی مرکز پہلے کوفہ ازان بعد دمشق منتقل ہو گیا تھا لیکن مدینہ منورہ کی علمی برتری، اس کے بعد بھی قائم رہی، اور یہیں سے احکام و فتاویٰ، صحابہ کی مجلس ۲۰ء میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں بھیجے جاتے تھے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب سوم، فصل اوّل)

- ۱۔ جواد علی، ڈاکٹر، تاریخ طبری کے ماخذ، ص ۲۳ (مترجم نثار احمد فاروقی) (دوست ایسوسی ایٹ، لاہور، ۱۹۹۸ء)۔
- ۲۔ ایضاً، ص ۲۰۔
- ۳۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ جلد ۲، ص ۲۲۳۔
- ۴۔ اطہر مبارک پوری، تدوین و سیر مغازی، ص ۱۶۷۔
- ۵۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ جلد ۳، ص ۲۲۹۔
- ۶۔ اطہر مبارک پوری، ص ۳۴ (بحوالہ بخاری 'صحیح بخاری' کتاب الجہاد و السیر)۔
- ۷۔ ایضاً (بحوالہ کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل جلد ۳، ص ۴)۔
- ۸۔ اطہر مبارک پوری، تدوین و سیر مغازی، ص ۳۵۔
- ۹۔ اُسد الغابہ جلد ۳، ص ۴۲۳۔
- ۱۰۔ اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۸۳ (بحوالہ وفاء الوفاء، جلد ۳، ص ۷۹۳)۔
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۸۴۔
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۴۸۔
- ۱۳۔ طبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۴۳۔
- ۱۴۔ ابن حبیب بغدادی، کتاب المنمق، ص ۴۲۵، ۴۲۹۔
- ۱۵۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حسب معمول ایک رات یہ مجلس جمی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں مہاجرین اور قریش کا تذکرہ آیا، ایک صاحب نے بعض قریشی لوگوں کا ذکر مبالغہ آمیز انداز میں کیا، اس کے جواب میں دوسرے صاحب نے کہا کہ اہل قریش کا، مہاجرین کے ساتھ کیا مقابلہ؟ خدا کی قسم اہل قریش تو موالی (یعنی آزاد کردہ غلام) ہیں، جن کو (فتح مکہ کے موقع پر) مہاجرین نے گھیرے میں لینے کے بعد آزاد کر دیا ہے، اس

موقع پر رسول اللہ نے اہل قریش سے فرمایا تھا کہ ”لا تشریب علیکم الیوم، انتم الطلقاء“ (آج تم پر کوئی ملامت نہیں، تم سب آزاد ہو)۔ مروان بن حکم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو نماز فجر کے بعد منبر پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ کہاں ہے وہ شخص جس نے امیر المؤمنین (یعنی حضرت معاویہ) کو غلام بتایا ہے، اور سخت دھمکی دی۔ یہ معاملہ حضرت عائشہ صدیقہ تک پہنچا انہوں نے فرمایا افسوس مروان اس بات کا انکار کر رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد ان کی جان کو ان ہی کو ہبہ کر دیا ہے۔ مروان نے اس واقعہ کی پوری تفصیل حضرت معاویہ کو لکھ بھیجی، اور انہوں نے اس کے جواب میں لکھا فسد والله مجلس القلادة، لعن الله مروان اور یہی ہوا کہ اس ناگوار واقعہ کے بعد مجلس قلادہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ (ابن حبیب بغدادی کتاب المنطق، ص ۴۴۵ تا ۴۴۹)

۱۶۔ اطہر مبارک پوری ’مدوین سیر و مغازی‘، ص ۷۱۔

۱۷۔ ابن سعد، طبقات اللبری جلد ۸، ص ۳۷۸۔

۱۸۔ محمد عبدالمعبود تاریخ المدینہ منورہ، ص ۲۶۸ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

۱۹۔ عروہ بن زبیر کے محلات کے باقیات اب بھی وادی عقیق میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۰۰۷ء میں جب راقمہ دوسرے حج کے لیے گئی تو ان باقیات کا مشاہدہ کیا تھا۔

۲۰۔ اس حوالے سے مدینہ کے سات فقہاء پر مشتمل ایک کمیٹی تھی جو ”فقہائے سبعہ مدینہ“

کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ مدینہ کی فقہ انہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج

بحث ہیں۔ ان ساتوں فقہاء کے ناموں کے لیے رجوع کیجئے، اسی کتاب کا باب اول

حاشیہ نمبر ۱۱۔



## سیرت و مغازی پر اولین کتب کی تدوین

جیسا کہ پچھلی فصل میں تذکرہ کیا گیا کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں سیر و مغازی کا تذکرہ مسلمانوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ طرح طرح سے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، باتوں بات میں، عمومی اور خصوصی مجلسوں میں، مساجد کے حلقہ ہائے درس میں اور میدان جہاد میں ان کا ذکر کرتے، غزوات کے مقامات و مشاہد اور مقابر کی زیارت کرتے۔ یوں تو مغازی و سیر کا چرچا، مکہ مکرمہ، بصرہ، کوفہ اور شام وغیرہ میں بھی تھا لیکن مدینہ اولین مدرسۃ المغازی تھا۔ جس طرح سے علوم القرآن اور حدیث کا آغاز مدینہ طیبہ سے ہوا اسی طرح سیر و مغازی کا اولین مرکز بھی مدینہ ہی تھا، لہذا بڑی فطری سی بات ہے کہ سیر و مغازی کی ابتدائی کتب کی تدوین بھی مدینہ میں ہی ہوئی۔

عہد خلافت راشدہ میں تکثیر روایت سے روکا گیا تھا تا کہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث کی طرف نہ جھک جائیں۔ لیکن غزوات و سرایا کے بیان کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے گئے۔ جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا کہ خلافت راشدہ اور خلافت بنو امیہ کا تقریباً پورا دور اسلامی فتوحات سے پر تھا، اس دور میں مسلمانوں میں ایمانی حرارت اور جذبہ جہاد کے بقاء و تحفظ کے لیے غزوات کے واقعات اور ان سے متعلق احکام و مسائل زیادہ سے زیادہ بیان کیے جاتے تھے اور ان سے تشویق و ترغیب کا کام لیا جاتا تھا۔ علم مغازی کی یہی اہمیت و افادیت، اس کی باقاعدہ تدوین کا باعث ہوئی اور پہلی

صدی ہجری کے نصف ثانی ہی میں مدینہ منورہ میں اجلہ تابعین نے کتاب المغازی کے نام سے کم از کم تین کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد دوسری صدی کی ابتداء میں احادیث کے جمع و ترتیب کا کام شروع ہوا، اور دوسری صدی ہجری کے نصف میں پورے عالم اسلام میں فقہی ترتیب پر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ گویا احادیث کی تدوین سے تقریباً سو سال پہلے سیر و مغازی پر کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔

متقدمین سیرت نگاروں کے حوالے سے ہم سیر و مغازی کی تدوین کے دو ادوار متعین کر سکتے ہیں۔

۱۔ دورِ اول : پہلا دور پہلی صدی ہجری کے نصف آخر سے دوسری صدی

ہجری کے وسط تک ہے۔ اس دور میں مغازی اور سیرت پر لکھنے والے زیادہ تر محدثین اور فقہائے مدینہ تھے۔ اس دور میں سیرت اور مغازی کی ابتدائی کتب لکھی جا چکی تھیں لیکن سیرت کو حدیث سے جدا کرنا دشوار تھا۔

۲۔ دورِ ثانی : دوسرا دور، دوسری صدی ہجری کے وسط سے شروع ہوتا ہے اور

تیسری صدی ہجری کے اواخر تک جاتا ہے۔ اس میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ چلا، علیحدہ علیحدہ موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ اور سیرت پر اہم تصانیف منظر عام پر آئیں۔ اس دور میں سیرت نگاری فنی طور پر سامنے آئی۔ سیرت نگاری کا علیحدہ تشخص قائم ہوا اسی دور میں رفتہ رفتہ سیرت اور حدیث کے راستے جدا ہونے لگے۔

مدینہ میں دور اول کے اولین سیرت نگاروں میں حضرت ابان بن عثمان، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت ابن شہاب زہری کا نام لیا جاتا ہے۔ ذیل میں تالیف و صاحب تالیف کا تفصیلی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت عروہ بن زبیر اور ان کی کتاب المغازی:

حضرت عروہ بن زبیر، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت ابن شہاب زہری

مدینہ کے یہ تین ہم عصر مصنفین مغازی ہیں، ان کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہنا کہ سیرت و مغازی کی پہلی کتب کس نے لکھی تھی دشوار ہے، تاہم اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ) اور ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ) نے سب سے پہلے مغازی پر کتابیں لکھیں اور محمد بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) نے ان کے بعد کتاب لکھی۔ بعض قرآن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عروہ بن زبیر کو، کتاب المغازی لکھنے کے حوالے سے ابان بن عثمان پر اولیت حاصل ہے۔ ۳

ابو عبداللہ عروہ بن زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد قرشی اسدی مدنی (م ۹۴ھ) کے والد حضرت زبیر بن العوام، حواری رسول، عشرہ مبشرہ اور اصحاب شوریٰ میں سے تھے۔ عروہ ۲۳ھ / ۶۴۳ء اور ۲۹ھ / ۶۴۹ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق کے نواسے تھے، حضرت عبداللہ بن زبیر کے چھوٹے بھائی تھے اور عمر میں ان سے تقریباً تیس سال چھوٹے تھے۔ آپ کو زبردست خاندانی وجاہت حاصل تھی اور کئی حوالوں سے خاندان نبوی سے قرب و اتصال حاصل تھا۔

انہوں نے جنگ جمل (۳۶ھ) میں شرکت نہیں کی۔ جس میں ان کے والد شہید ہوئے تھے۔ اس لیے کہ یہ اس وقت صرف دس سال کے تھے سات سال (۵۸ھ تا ۶۵ھ) مصر میں گزارے۔ جب امویوں نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کیا تو اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ تھے لیکن ان کی شکست کے بعد وہ عبدالملک بن مروان کے پاس شام چلے گئے۔ عبدالملک سے ان کی سسرالی رشتہ داری بھی تھی وہ اس طرح سے کہ عبدالملک بن مروان کے والد مروان بن حکم کی ایک بہن ام یحییٰ بنت الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبدشمس۔ عروہ بن زبیر کی ایک بیوی تھیں۔ ۴۔

اس کے علاوہ خلیفہ بننے سے قبل جبکہ عبدالملک بن مروان اپنے والد مروان بن حکم کے ساتھ مدینہ میں رہائش پذیر تھا تو اس کی عبداللہ ابن زبیر، مصعب ابن زبیر اور

عروہ بن زبیر سے خاصی دوستی تھی۔ اسی دوستی کے پیش نظر جب عبداللہ ابن زبیر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر قتل ہو گئے تو عروہ بن زبیر (۷۳ھ) میں سیدھے عبدالملک کے دربار میں پہنچ گئے۔ قبل اس کے کہ حجاج بن یوسف سے خلیفہ عبدالملک کو عبداللہ ابن زبیر کی شکست اور قتل کی اطلاع ملتی۔ عروہ، عبدالملک کے پاس پہنچے، عبدالملک نے ان کا خیر مقدم کیا، انہی نے عبدالملک کو اپنے بھائی عبداللہ ابن زبیر کے قتل اور شکست کی اطلاع دی، اور ان کو بتایا کہ حجاج بن یوسف نے عبداللہ ابن زبیر کی لاش کو سولی دی ہوئی ہے، ان کی درخواست پر عبدالملک نے حجاج کو حکم بھجوایا کہ عبداللہ کی لاش سولی پر سے اتاری جائے، عبدالملک نے عروہ بن زبیر کو آمان بھی عطا کی، اس کے بعد عروہ مدینہ واپس آ گئے، حجاج نے عبداللہ کی لاش سولی سے اتار کر ان کی والدہ اسماء بنت ابی بکر کے حوالے کر دی تھی۔ عروہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین عمل میں لائی گئی۔ ۵

عروہ بن زبیر دوسری بار دمشق ۸۶ھ میں گئے جب ولید بن عبدالملک تخت خلافت پر بیٹھا، اس وقت ان کے ہمراہ ان کا بیٹا محمد (جن کی ماں ام یحییٰ بنت حکم بن ابی العاص تھیں) اور ان کا ایک دوست شاعر اسماعیل بن یسار بھی تھا۔ اس سفر میں انہیں دو مصیبتیں پہنچی، ایک یہ کہ ان کی ٹانگ زہر پھیل جانے کی وجہ سے کاٹنی پڑی دوسرے ان کا بیٹا محمد، شاہی اصطبل میں گر پڑا اور گھوڑے نے انہیں سم مار مار کر ہلاک کر دیا۔

عروہ بن زبیر نے سیاست سے کنارہ کش رہ کر فقہ، حدیث اور علم المغازی میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے بہت سے صحابہ اور صحابیات سے حدیث کی روایت کی اور تفقہ کی تعلیم اپنی خالہ، حضرت عائشہ سے حاصل کی۔ وہ فقہ اور فتویٰ میں حضرت زید بن ثابت کے بارہ مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ فصل میں بھی لکھا گیا، ان کا ایک مدرسہ ”کتاب عروہ“ کے نام سے مسجد غمامہ کے قریب تھا، اسی کے پاس مسجد بنی زریق بھی تھی یہاں آپ لوگوں کو تعلیم

دیا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر کی ملکیت میں وادی عقیق میں قصر عروہ اور بیس عروہ کے علاوہ شاندار نخلستان اور باغات تھے، اپنے دور کے فتنوں سے دور رہ کر زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی۔ ۶۳ھ میں مدینہ منورہ میں واقعہ حرہ پیش آیا، اس سے قبل ۶۱ھ میں حادثہ کربلا پیش آیا، مگر ان حوادث و فتن میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عرصہ میں وہ مصر میں مقیم تھے البتہ واقعہ حرہ میں ان کی کئی کتابیں جل گئیں تھیں۔ جو ان کے مدینہ والے گھر میں رہی ہوں گی۔

ہشام بن عروہ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد نے اپنی بہت سی فقہ کی کتابیں یوم الحمرہ میں جلا دی تھیں جن کا ان کو عمر بھر افسوس رہا ۱۔ یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اس وقت عروہ مصر میں تھے۔ واقعہ حرہ کے وقت عروہ بن زبیر کی عمر چالیس سال تھی، اس مدت میں انہوں نے جو کتابیں لکھیں یا جمع کیں اس میں کتاب المغازی بھی رہی ہوگی جس کی تدوین ۶۳ھ سے پہلے ہو چکی تھی اور جس کی خبر عبدالملک بن مروان کو تھی۔

حضرت عروہ کا شمار مدینہ کے سات ممتاز فقہاء ”فقہائے سبعہ مدینہ“ میں ہوتا تھا۔ وہ محدث بھی تھے اور اپنے تلامذہ سے احادیث اور صدر اسلام کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ ابن اسحاق، واقدی اور طبری نے ان کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ وہ سیرت رسول اللہ کے قدیم ترین مصنف بھی تھے اور سیرت و مغازی کے متعلق لوگوں کے سوالات کے جوابات اپنی جمع کردہ احادیث سے دیا کرتے تھے ۸۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان بذریعہ خطوط رسول اللہ کی سیرت مغازی کے حوالے سے آپ سے سوالات پوچھا کرتا تھا۔ اس کے جواب میں آپ جو تفصیلات بیان کرتے تھے، انہی کو آپ نے بعد میں کتابی شکل میں مرتب کر لیا تھا۔ عبدالملک کے سوالات اور عروہ کے جوابات کا تعلق زیادہ تر غزوات سے ہے۔ عروہ نے ان واقعات کو بیان کرنے میں سند کی سختی سے پابندی نہیں کی بلکہ واقعات کو سلسلہ وار بیان کر دیا ہے، مگر جن واقعات

کا تعلق غزوات سے نہیں ہے مثلاً آغاز وحی، ہجرت حبشہ وغیرہ، ان کے اندر سند کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہجرت نبوی کے بیان میں بھی انہوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ انہیں یہ معلومات حضرت عائشہ سے حاصل ہوئی تھیں، علاوہ ازیں وہ تحریری دستاویزات کو بھی اپنا ماخذ بنا لیتے تھے، مثلاً انہوں نے کوشش کر کے، رسول اللہ کے اصل خطوط حاصل کیے جو آپ نے اہل ہجر، ذراعہ بن ذی بزن، اور عبداللہ بن جحش کو ارسال فرمائے اور انہیں جوں کاتوں نقل کیا ۹۔

عروہ بن زبیر کی ”کتاب المغازی“ کو آپ کے کئی تلامذہ نے آپ سے روایت کیا جن میں ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن جو ”یتیم عروہ“ کی نسبت سے مشہور تھے، اس کتاب کے خاص راوی اور معلم تھے۔ بعض اوقات ”کتاب المغازی“ کی نسبت، اس عہد کے عام رجحان کے مطابق ابوالاسود کی طرف بھی کر دی جاتی ہے مگر اس سے حضرت عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی مراد ہوتی ہے۔ اصل میں عروہ بن زبیر کی ”کتاب المغازی“ کی روایت، ابوالاسود نے اس طرح کی کہ اس میں اپنے دیگر طرق و اسناد سے روایتیں بیان کیں، اور اس کی حیثیت مستقل کتاب کی ہو گئی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے امام مالک کی کتاب الموطاء کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں اور اپنے اپنے مرتبین کے نام سے مشہور ہیں، کیونکہ ان کے تلامذہ نے ان کی کتاب الموطاء میں دوسرے طرق سے بھی احادیث جمع کیں۔ المختصر ابوالاسود یتیم عروہ کی جو ”کتاب المغازی“ مشہور ہے وہ انہی عروہ بن زبیر کی ”کتاب المغازی“ ہے۔ اس کتاب کے حوالے کتب سیرت و حدیث میں جا بجا ملتے ہیں خصوصاً حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی ’فتح الباری‘ میں اس سے استفادہ کیا ہے اس کتاب کا ذکر ابن الندیم کے علاوہ ذہبی ۱۰، سخاوی ۱۱ اور حاجی خلیفہ ۱۲ نے بھی کیا ہے۔

عروہ بن زبیر کی ”کتاب المغازی“ کو اصل شکل میں ہمارے سامنے موجود نہیں

ہے مگر ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نے مغازی کے حوالے سے حضرت عروہ کی مرویات کو ابوالاسود کی روایت سے جمع کیا ہے۔ اور ”مغازی عروہ بن زبیر“ کو دوبارہ مرتب کر دیا ہے، اس کا اردو ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے ۱۳۔ یہ کتاب مختصر مگر مستند اور مربوط ہے اور اس سے عروہ بن زبیر کے منطقی اور تجزیاتی انداز فکر کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر واقعہ بیان کرنے سے قبل اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً غزوہ بدر سے پہلے مسلمانوں اور قریش کی چپقلش کا مختصر بیان اور ہجرت حبشہ کا واقعہ روایت کرنے سے پہلے ان حالات کا ذکر جو اس واقعہ کا سبب بنے، انہوں نے اپنی کتاب المغازی میں واقعات کی ترتیب میں تاریخی تسلسل کو ملحوظ رکھا۔ ان کی یہ کتاب بعد کے سیرۃ نگاروں کے لیے اہم نمونہ ثابت ہوئی۔ عروہ کا انتقال ۹۴ھ میں الضرع کے پاس اپنی جاگیر مجاح میں ہوا۔ اس سال کو فقہاء کی کثرت وفات کی وجہ سے ”سنۃ الفقہاء“ کہا جا تا ہے۔ ۱۴

## ۲۔ حضرت ابان بن عثمان اور ان کی کتاب المغازی:

سیرت اور مغازی کے موضوع پر کتابیں تالیف کرنے والے ابتدائی سیرت نگاروں میں دوسرا نام ابوسعید ابان بن عثمان (۲۰ھ - ۱۰۰ھ) کا آتا ہے۔ آپ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ابن عفان کے بیٹے تھے، ان کی والدہ ام عمرو بنت جندب تھیں۔ ابن سعد کے مطابق تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شامل تھے۔

جنگ جمل میں جو کہ ۳۶ھ / ۶۵۶ء میں حضرت عائشہ اور حضرت علی کے مابین لڑی گئی، یہ حضرت عائشہ کے ہمراہ تھے اس وقت ان کی عمر سولہ برس تھی، تاہم اس کے بعد انہوں نے سیاسی معاملات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ خلافت میں ۷۵ھ میں مدینہ منورہ کے والی مقرر ہوئے، اس منصب پر وہ سات سال تک فائز رہے یہاں تک کہ عبدالملک ہی نے انہیں ۸۳ھ میں معزول کر دیا یہ عزل و

نصب اتفاقی تھا۔ اس وقت مدینہ کے عامل یحییٰ بن حکم بن ابی العاص بن امیہ تھے جو عبدالملک بن مروان کے چچا تھے، ان میں حماقت تھی، وہ بغیر اجازت و اطلاع ایک وفد لے کر عبدالملک کے پاس شام چلے گئے اور ابان بن عثمان کو اپنا نائب بنا گئے۔ اس پر ناراض ہو کر عبدالملک نے یحییٰ بن حکم کو معزول کر دیا اور ابان کو مدینہ کی گورنری پر برقرار رکھا۔ ۱۵۔

علم و فضل میں ان کا بڑا مرتبہ تھا، فقہائے سبعہ مدینہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، جداگانہ انداز قرأت کے حامل تھے ۱۶۔ حضرت زید بن ثابت ان کے شیخ الكل تھے اور ابان انہی کے فقہی و اجتہادی مسلک کے ترجمان تھے۔ حضرت زید بن ثابت کے بارہ مخصوص تلامذہ ہیں جو ان کے فقہ کے ترجمان و ناشر ہیں، ان میں ابان بن عثمان بھی ہیں۔ نیز انہوں نے اپنے والد عثمان بن عفان، أسامہ بن زید بن حارثہ وغیرہ سے روایت کی ہے، ان کے تلامذہ کی تعداد زیادہ ہے تاہم ان میں محمد ابن شہات زہری اور مغیرہ بن عبدالرحمن زیادہ مشہور ہیں، موخر الذکر ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں ۱۷۔ روایت حدیث کے حوالے سے ثقہ مانے جاتے تھے۔ ان کی وفات کی تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے ۹۶ھ تا ۱۰۵ھ کے درمیان ان کا انتقال ہوا۔ وفات سے ایک سال قبل انہیں فالج ہو گیا تھا۔

ان کی کتاب، مغازی پر لکھی جانے والی قدیم کتابوں میں شامل تھی بلکہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مغازی کی سب سے پہلی کتاب مرتب کی تھی جسے مغیرہ بن عبدالرحمن نے روایت کیا تھا۔ یہ کتاب ۸۲ھ سے پہلے لکھی جا چکی تھی مگر ایک خاص واقعہ کی وجہ سے اس کی روایت و اشاعت بہت محدود طریقے پر ہوئی۔ ۸۲ھ میں جبکہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ خلافت تھا، سلیمان بن عبدالملک، جو اس وقت ولی عہد تھا، حج اور زیارت کے سلسلہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ مدینہ کے اعیان و اشراف نے اس کا



استقبال کیا، چونکہ اس وقت اُبان بن عثمان گورنر مدینہ تھے، لہذا وہ بھی پہنچے، سلیمان بن عبدالمملک نے اُبان بن عثمان، ان کے بھائی عمرو بن عثمان اور ابوبکر بن عبداللہ بن ابواحمد کے ساتھ مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ جن جگہوں میں رسول اللہ نے نماز پڑھی یا صحابہ شہید ہوئے ان مقامات کو دیکھا، جبل اُحد، مشربہ ام ابراہیم کی زیارت کرتا ہوا قبا تک گیا اور ہر مقام و مشہد کے بارے میں اپنے ہمراہ علماء سے معلومات حاصل کرتا رہا اور یہ حضرات اس کو تفصیلات بتاتے رہے۔

قبا پہنچ کر اس نے اُبان بن عثمان سے کہا کہ آپ میرے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت و مغازی پر ایک کتاب مرتب کر دیں۔ اُبان نے جواباً کہا کہ یہ کتاب تو میں پہلے ہی مرتب کر چکا ہوں، سلیمان نے دس کتابوں کو مقرر کیا اور ان کی کتاب کو نقل کرنے کا حکم دیا۔ کھال پر یہ کتاب نقل ہو کر جب سلیمان بن عبدالمملک کے ہاتھ میں پہنچی اور اس نے کتاب میں عقبہ اولیٰ، عقبہ ثانیہ اور غزوہ بدر میں انصار کا تذکرہ دیکھا تو کہنے لگا کہ میں ان لوگوں کو ان فضائل کا مستحق نہیں سمجھتا یہ سن کر اُبان بن عثمان نے کہا ”امیر، انصار نے شہید مظلوم (حضرت عثمان) کے ساتھ جو کچھ کیا اور ان کی مدد نہیں کی، اس کی وجہ سے ہم حق بات کہنے سے تو باز نہیں رہ سکتے، وہ لوگ ان ہی اوصاف کے مستحق ہیں جن کا ذکر ہم نے کتاب میں کیا ہے۔“

یہ جواب سن کر سلیمان بن عبدالمملک نے کہا کہ ”مجھے اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے اس کے بارے میں امیر المومنین (یعنی عبدالمملک مروان) سے بات کر لوں، شاید وہ اس کی مخالفت کریں۔“ یہ کہہ کر سلیمان نے کتاب کو پھاڑنے کا حکم دیا اور کہا، ”یہاں سے واپس جا کر امیر المومنین سے بات کروں گا اگر انہوں نے رضامندی ظاہر کی تو اس کا لکھنا آسان ہے۔“

اس کے بعد سلیمان نے دمشق پہنچ کر اپنے والد، خلیفہ عبدالمملک بن مروان سے

أبان بن عثمان کی کتاب کے بارے میں بتایا، عبدالملک نے کہا، ”ہم ایسی کتاب یہاں کیوں لائیں جس میں ہمارے لیے کوئی منقبت و فضیلت نہیں ہے، ہم اہل شام کو ایسی باتیں بتانا نہیں چاہتے ہیں۔“ سلیمان نے باپ کی یہ باتیں سن کر کہا کہ اسی لیے جو نسخہ میں نے نقل کرایا تھا اس کو پھاڑ دینے کا حکم دے دیا تھا، آپ کی رائے مقدم ہے۔“ ۱۸۔

ہوسکتا ہے عبدالملک نے أبان بن عثمان کو اسی ”قصور“ پر گورنری کے عہدے سے ہٹا دیا ہو، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ أبان اموی خلفاء و امراء سے خوش نہیں تھے اور ان پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ایک بار عبدالملک کے وائی مکہ علقمہ بن صفوان بن محدث نے منبر پر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر پر سب و شتم کیا اور منبر سے اتر کر أبان سے کہا ”امیرالمومنین حضرت عثمان کی شہادت کے بارے میں مداہنت کرنے والوں کو میں نے برا بھلا کہہ کر آپ کو خوش کر دیا۔“

یہ سن کر أبان بن عثمان نے کہا ”واللہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تم نے مجھے تکلیف دی۔ میری مصیبت کے لیے یہی کافی ہے کہ تم بھی ان کے خون میں شریک ہو۔“ ۱۹۔

۹۱ھ میں ولید بن عبدالملک نے وائی مدینہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو حکم دیا کہ مسجد نبوی کی دوبارہ تعمیر کر کے اس میں اضافہ کریں۔ اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان کی تعمیر ختم کر کے مسجد نبوی کی نہایت خوبصورت عمارت بنوائی، اس کی تعمیر تین سال میں مکمل ہوئی تو ولید بن عبدالملک مدینہ آیا، لوگ اس کے استقبال کے لیے آئے، أبان بھی پاکی پر آئے، ولید نے ان سے کہا آپ کی تعمیر کو ہماری تعمیر سے کیا نسبت ہے؟ ابان بن عثمان نے جواب دیا کہ امیرالمومنین ہماری تعمیر اس سے بہتر تھی، ولید نے وجہ دریافت کی تو بتایا کہ ہماری تعمیر مسجد کی تعمیر تھی، اور آپ لوگوں کی تعمیر کلیسا کی تعمیر ہے، اتنا کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر چلے گئے، ولید دور تک ان کو دیکھتا رہا کہ یہ ابان بن عثمان بن عفان ہیں۔ ۲۰۔

الغرض ابان نے اپنی کتاب المغازی میں مصلحت و سیاست سے بالاتر ہو کر واقعات اور حقائق بیان کیے جس کی وجہ سے اس کی روایت عام طور سے نہیں ہو سکی ظاہر ہے جس کتاب کو خلیفہ وقت نے جلوادیا ہو اس کی روایت عام نہیں ہو سکتی۔ ان کے تلامذہ میں صرف مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی ۲۱ نے ان کے نام سے اس کی روایت کی اور اپنی اولاد اور تلامذہ کو اس کی تعلیم و ترغیب دی۔ ان کے پاس ابان بن عثمان کی کتاب المغازی موجود تھی۔ بعد کے مورخین نے یا تو ان کی روایات نہیں لیں اور یا اگر لیں تو ان کا نام نہیں لیا۔ لیکن مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی جب تک حیات رہے ابان بن عثمان کی کتاب المغازی کے خاص راوی، معلم اور ناشر تھے اور اس وقت تک ابان کی کتاب اموی امراء کے علی الرغم پڑھی پڑھائی جاتی تھی۔ البتہ بعد میں ان کے مقابلے میں عروہ بن زبیر اور ابن شہاب زہری کی کتب ہائے مغازی زیادہ روایت کی جانے لگیں۔ اور ابان بن عثمان کی کتاب المغازی پردہ اخفا میں چلی گئی۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو خلیفہ مظلوم (حضرت عثمان غنی) کے بیٹے بھی مظلوم تھے

### ۳۔ مغازی ابن شہاب زہری:

دورا اول کے تیسرے مصنف مغازی ابو بکر محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری مدنی (م ۱۲۴ھ) تھے۔ علمائے تابعین میں دینی و علمی جامعیت میں بے مثال تھے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۵۰ھ تا ۵۷ھ کے درمیان بتائی جاتی ہے انہوں نے حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ اور سیر و مغازی کی تدوین کے سلسلے میں خاص شہرت حاصل کی۔ وہ قریش کی شاخ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے، ابتدائی زمانہ مدینہ میں گذارا، ابن اشعث کی بغاوت کے بعد ۸۰ھ/۶۹۹ء میں شام چلے گئے تھے، تاہم آخر عمر میں واپس مدینہ آگئے تھے۔ مدینہ میں آپ نے عبد اللہ بن عمر، سہل بن سعد، انس بن مالک، محمود بن ربیع، سعید بن مسیب، ابو امامہ بن سہل اور اس طبقہ کے دوسرے صحابہ اور کبار تابعین سے

علم حدیث حاصل کیا اور آپ سے عقیل، یونس، زبیدی، صالح بن کیسان، معمر، شعیب بن ابی حمزہ، امام اوزاعی، امام مالک، امام لیث بن سعد، ابن ابی ذؤب، عمرو بن حارث، ابراہیم بن سعد، سفیان بن عیینہ اور دوسرے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں ۲۲۔

علم حدیث میں آپ کی مساعی قابل قدر ہیں۔ زہری سے دو ہزار دو سو احادیث مروی ہیں، امام زہری کا اپنا بیان ہے کہ میں نے سعید بن مسیب کے حلقہ درس میں مسلسل آٹھ سال حاضری دی ہے۔ ابو زناد کہتے ہیں ہم زہری کے ساتھ مختلف علماء کے حلقہ ہائے درس میں شریک ہوا کرتے تھے، ان کے پاس تختیاں اور کاغذ ہوتے تھے اس لیے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیتے تھے۔ امام لیث بن سعد کہتے ہیں ”میں نے زہری سے زیادہ کوئی جامع العلم نہیں دیکھا، اگر آپ انہیں ترغیب و ترہیب بیان کرتے سنیں تو کہیں گے یہ اس فن میں ماہر ہیں، اگر انساب العرب پر کلام کریں تو آپ کہیں گے یہ اس علم میں بے نظیر ہیں اور اگر کتاب و سنت بیان فرمائے لگیں تو آپ کا تاثر یہ ہوگا کہ یہ اس فن میں یکتائے زمانہ ہیں“ ۲۳۔ خود امام زہری فرماتے ہیں طلب علم میں جس قدر سختیاں میں نے جھیلی ہیں کسی نے نہیں جھیلیں اور اس کی نشر و اشاعت میں جتنی کوشش میں نے کی کسی نے نہیں کی ۲۴۔ آپ کا حافظہ کمال کا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں میں نے پڑھتے وقت استاد سے کسی حدیث کو دوبارہ بیان کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا اور نہ مجھے کبھی کسی حدیث میں شک ہوا ہے۔ ایک دفعہ مجھے ایک حدیث میں شک ہوا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھی تو اسی طرح نکلی جس طرح مجھے یاد تھی ۲۵۔ یہ ان کے حافظے کا کمال ہے کہ آپ نے اسی دن کی قلیل مدت میں پورا قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا۔ کسی نے شام کے مشہور عالم مکحول دمشقی سے پوچھا، جن اہل علم سے آپ کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے، ان میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ بولے، ابن شہاب، اس نے کہا اس کے بعد، فرمایا وہ بھی ابن شہاب ہی ہے ۲۶۔

اموی خلفاء سے ان کے خاص تعلقات تھے، وہ ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان

سے ملاقات کے لیے گئے اس نے بہت اکرام کیا اور آپ کا قرض بھی ادا کر دیا۔ امام زہری اپنے جو دو سخا کی وجہ سے بار بار مقروض ہو جاتے تھے۔ خلیفہ یزید ثانی (۱۰۴ھ تا ۱۰۵ھ) کے دور میں قاضی کے فرائض انجام دیئے، ہشام بن عبد الملک کے دور (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) میں اس کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اگر چہ زہری خلفائے بنو امیہ کے قریب تھے تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے دربار سے وابستہ تھے، کئی واقعات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اموی خلفاء و امراء سے امام زہری کے تعلقات، انہیں حق بات کہنے سے نہیں روکتے تھے مثلاً ایک واقعہ تو یہ ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے ایک آیت کے مفہوم کے بارے میں امام زہری سے استفسار کیا۔ زہری نے جواب دیا کہ اس آیت کا اطلاق (مشہور منافق) عبد اللہ بن ابی پر ہوتا ہے۔ ہشام کے خیال میں اس سے حضرت علیؓ مقصود تھے۔ جب زہری نے اپنی رائے پر اصرار کیا تو ہشام نے انہیں جھوٹا قرار دیا زہری نے جواباً کہا کہ ”خدا کی قسم اگر آسمان سے یہ آواز سنائی دے کہ خدا نے جھوٹ بولنے کی اجازت دے دی ہے تو بھی میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ ۲۷

اسی حوالے سے ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ معمر بن عبد الرزاق کہتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ کس نے لکھا تھا؟ پہلے تو وہ ہنسے پھر کہا علی بن الخطاب نے لکھا تھا، اور اگر تم اس کے بارے میں ان لوگوں سے یعنی بنو امیہ سے پوچھو گے تو وہ عثمان ابن عفان کا نام لیں گے۔ ۲۸

اس سلسلہ میں تیسرا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ گورنر عراق خالد بن عبد اللہ القسری ۲۹ نے امام زہری سے انساب اور سیرۃ پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی انہوں نے کتاب الانساب لکھنی شروع کی۔ لیکن ابھی وہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ خالد نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور کہا میرے لیے سیرۃ پر کتاب لکھ دو۔ اس پر زہری نے جواب دیا کہ سیرت لکھتے وقت میرے سامنے علی بن ابی طالب کی سیرۃ بھی آئے گی اور میں ان کا تذکرہ بھی

کروں گا، اس پر اس نے کہا ”ہرگز نہیں الا یہ کہ تم ان کو جہنم کے اتھاہ گڑھے میں دیکھو“۔ ۳۰

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) آپ کے بڑے قدردان تھے اور فرماتے تھے کہ زہری سے بڑھ کر صحیح احادیث کو جاننے والا کوئی شخص نہیں رہا۔ عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کتابیں لکھوائیں۔ دو کاتب مقرر کئے گئے جنہوں نے دو سال تک ان کے علوم کو کتابی شکل میں جمع کیا۔ امویوں کے شاہی کتب خانے میں امام زہری کی کئی بارشتر کتابیں موجود تھیں۔ ۳۱

فواد سیزگن محدث کے طور پر انکے دو علمی کارنامے بتاتے ہیں۔ ان کا پہلا کارنامہ تو یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے محدث تھے جنہوں نے احادیث میں اسناد کا التزام کیا۔ ان کے زمانے سے پہلے حدیث کا ذخیرہ یا تو اسناد سے خالی تھا یا زبانی روایات پر مشتمل تھا اور سارے عالم اسلام میں منتشر تھا۔ امام زہری کے زمانے میں صحابہ کرام جنہوں نے رسول اللہ کو دیکھا تھا اور اوائل تابعین کی روایت کردہ بہت سی احادیث زبانی یا منتشر تحریریں میں موجود تھیں انہوں نے رواد کے ناموں سمیت انہیں مدون کیا۔ ۳۲

امام زہری کے بارے میں یہ بھی ملتا ہے کہ ان کے پاس بہت سے راویان یا مؤلفین حدیث اپنے کراسے یا نوشتے لے کر حاضر ہوتے کہ امام صاحب ان میں رواد کے نام لکھ دیں لیکن مشاغل کے ہجوم میں ہر شخص کے مطالبے کو پورا کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، لہذا انہوں نے اپنے تلامذہ کو اجازت دے دی کہ وہ حدیث کو کسی شیخ سے سماع یا قرات کے بغیر روایت کر دیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس طریقے کو ”الاجازہ والکتبۃ“ کہا جاتا ہے ۳۳ فواد سیزگن اس حوالے سے گولڈ زیہر کے اس الزام کو رد کرتے ہیں کہ امام زہری نے بنو امیہ کی سلطنت کے استحکام کے لیے یہ طریقہ نکالا۔ فاضل مولف مزید کہتے ہیں ”امام زہری کے اس قول کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا کہ ہم علم کو کتابت کی

قید میں لانا ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ امراء نے ہمیں کتابت پر مجبور کیا۔ میری رائے میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے ”احادیث کو کسی شیخ سے سماع یا قرأت کے بغیر لکھ لیا جائے تو یہ طریقہ ہمیں منظور نہ تھا، لیکن افادہ عام کی غرض سے ہمیں امراء نے سماع یا قرأت کے بغیر کتابت پر مجبور کر دیا۔“ ۳۴

حدیث کے حوالے سے امام زہری کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے احادیث کو مدون کیا۔ گو امام زہری کے زمانے سے بہت پہلے تدوین حدیث کا آغاز ہو گیا تھا لیکن یہ تحریری سرمایہ کراسوں کی شکل میں پایا جاتا تھا، انہوں نے ان تمام تحریروں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ ۳۵

جہاں تک امام زہری کی مغازی و سیرت نگاری کا تعلق ہے فواد سیزگن، طبری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ زہری مورخ، علم المغازی اور ”اخبار قریش والانصار“ کے اولین مصنف تھے، اس کے علاوہ وہ رسول اللہ اور صحابہ کرام کے سوانح نگار بھی تھے وہ پہلے محدث ہیں جنہوں نے لفظ ”سیرت“ کو اس کے اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا۔ ۳۶

امام زہری سیر و مغازی کے مصنف اور امام تھے اور اس فن کو ”دنیا اور آخرت کا علم“ قرار دیتے تھے ۳۷ مغازی پر ان کی کتاب پہلی صدی ہجری کے اختتام پر لکھی گی، یہ کتاب اب موجود نہیں لیکن اس کے حوالے کثرت سے بعد کی کتب سیرت میں ملتے ہیں۔ بیشتر مستشرقین یہ بات نہیں مانتے کہ زہری نے سیرت پر کوئی کتاب لکھی تھی۔ ولیم میور لکھتے ہیں ”یہ بھی کہا گیا ہے کہ زہری اور ان کے استاد عروہ، دونوں نے باقاعدہ کتب سیرت محمد مرتب کیں، لیکن یہ بات غیر یقینی ہے، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ زہری نے احادیث کے ایسے کئی مجموعے مرتب کیے تھے جن میں رسول اللہ کی زندگی کے اہم واقعات مندرج تھے اور یقیناً ان واقعات کا تعلق رسول اللہ کے عسکری کردار سے تھا۔“ ۳۸

ولیم میور کا مندرجہ بالا بیان ان کا ذہنی خلجان ظاہر کرتا ہے اور اس خلجان کی وجہ

یہ ہے کہ بیشتر مستشرقین لفظ ”سیرت“ اور ”مغازی“ کے استعمال کے ارتقائی سفر سے آگاہ نہیں ہیں۔ ابتدائی دور میں لکھی جانے والی سیرت یا تاریخ کی کتابیں، کتب حدیث ہی کے طرز پر مع اسناد لکھی گئی تھیں۔ حدیث اور تاریخ کے راستے، کہیں تیسری صدی ہجری میں جا کر جدا ہوئے، علم حدیث اور علم سیرت و مغازی آغاز میں ایک ہی علم کا حصہ تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں علوم علیحدہ ہوتے چلے گئے۔

حضرت عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان کی کتب ہائے مغازی کی موجودگی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ امام زہری اولین سیرت نگار ہیں، ان سے قبل کبار تابعین سیرت کے موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے، سیرۃ و مغازی میں امام زہری کے اساتذہ، حضرت عروہ بن زبیر، ابان بن عثمان اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ۳۹ ھ تھے۔ اور مغازی اور سیرت کے موضوعات پر ان کی تحریریں موجود تھیں، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام زہری نے اپنے اساتذہ، عروہ بن زبیر، ابان بن عثمان، عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان انصاری اور عبید اللہ بن عتبہ کی روایات کو جمع کر کے ایک بڑا ذخیرہ مرتب کر لیا اور یوں مغازی پر ایک ضخیم کتاب تیار کی۔

امام زہری کی مرویات ان کے تلامذہ نے اپنی کتب میں محفوظ کیں ابن اسحاق کے ذریعہ امام زہری کی بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ابن ہشام نے سیرت رسول اللہ پر اپنی مشہور کتاب میں وہ تمام روایات امام زہری کے حوالے سے درج کی ہیں ۴۰ ھ ابن اسحاق کے علاوہ طبری اور ابن سید الناس نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں زہری کی روایات کو نقل کیا ہے۔ تاہم ان کے تلامذہ میں موسیٰ بن عقبہ (جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) نے ان کی ’کتاب المغازی‘ کی روایت کی جن کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول ہے ”زہری سے روایت کی ہوئی، موسیٰ بن عقبہ کی کتاب مغازی کی سب سے صحیح کتاب ہے۔“ ۴۱ ھ



امام بخاری نے مغازی کے ذکر میں چالیس سے زائد روایات ابن شہاب زہری کی بیان کی ہیں جن میں اکثر موسیٰ بن عقبہ عن الزہری کی سند سے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ مغازی موسیٰ بن عقبہ، امام زہری کی روایات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح امام زہری کے ایک اور شاگرد معمر بن راشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی کتاب المغازی درحقیقت زہری کی کتاب المغازی کا نسخہ ہے جس میں دوسرے شیوخ کی بھی روایتیں ہیں، اسی طرح امام زہری کے تیسرے قابل ذکر شاگرد محمد ابن اسحاق تھے جو زہری کی مرویات نقل کرنے میں سب سے آگے تھے۔ ۴۲

ڈاکٹر محمود الحسن نے ابن ہشام، ابن جریر طبری، اور ابن سید الناس کی کتابوں میں موجود امام زہری کی مغازی سے متعلق تمام روایتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ایک ایک روایت گنوا کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ”زہری کے سامنے سیرت نبوی کا ایک مکمل نقشہ موجود تھا، جس کے لیے تفصیل سے اس موضوع پر مواد اکٹھا کیا گیا تھا“ ۴۳ زہری نے زبانی پوچھ گچھ کے علاوہ بعض اصل تحریری مسودات بھی کدو کاوش کے بعد حاصل کیے اور انہیں اپنی کتاب میں جمع کیا، علاوہ ازیں انہوں نے رسول اللہ کے کارناموں کی تصدیق یا تشریح کے لیے قرآن پاک کی آیات کو بھی بطور شہادت پیش کیا ہے۔ پھر امام زہری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے واقعات درج کرتے وقت نہ صرف تاریخی تسلسل کا خیال رکھا بلکہ ایک ہی موضوع کی متعدد روایات کو جمع کر کے ایک نئی روایت بنا دیا ہے اور ساتھ ہی تمام راویوں کے نام بھی درج کر دیئے ہیں۔ ان کے اس انداز نے بعد میں آنے والے مورخین کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ ۴۴

الغرض بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدینہ منورہ وہ شہر تھا جہاں علوم اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔ علم مغازی و سیرت کا آغاز بھی مدینہ سے ہوا۔ اور پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں سیرت و مغازی کی ابتدائی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں عروہ بن

زبیر کی کتاب کو تقدم حاصل ہے، دوسری کتاب ابان بن عثمان کی اور تیسری کتاب ابن شہاب زہری کی سامنے آئی۔ یہ کتابیں ان کے شاگردوں نے روایت کیں، اور ان میں اضافہ کر کے صاحب المغازی بھی ہوئے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مدینہ منورہ کے ان ابتدائی سیرت نگاروں نے اپنی صوابدید اور احوال و ظروف کے پیش نظر اپنی اپنی کتاب المغازی لکھی، اس میں کسی خلیفہ یا امیر کے حکم یا خواہش کو دخل نہیں تھا جیسا کہ شبلی نعمانی کا خیال ہے ۴۵، یہ ضرور ہے کہ عبدالملک بن مروان نے عروہ بن زبیر سے مغازی

اور سیرت کے حوالے سے تحریری تفصیلات حاصل کی تھیں، نیز سلیمان بن عبدالملک نے اولاً ۸۲ھ میں ابان بن عثمان سے سیرت پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی لیکن جب ابان نے اسے بتایا کہ وہ ایسی کتاب پہلے ہی مرتب کر چکے ہیں، تو سلیمان نے اس کی نقل حاصل کی، مگر یہ دیکھ کر کہ اس کتاب میں انصار کے مناقب بھی بیان ہوئے ہیں اس نے نسخہ جلوادیا تھا۔ عروہ بن زبیر کی کتاب بھی واقعہ حرہ ۶۳ھ میں نذر آتش ہو چکی تھی، جس کا انہیں ہمیشہ افسوس رہا۔ ابن شہاب زہری کے بارے میں یہ تو ملتا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خواہش پر انہوں نے احادیث مرتب کیں، لیکن مغازی کی کتاب بھی انہی کے حکم پر لکھی، یہ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ تینوں ابتدائی کتب مغازی اپنی ابتدائی شکل میں باقی نہ رہ سکیں البتہ ان کی روایتیں، حدیث اور سیر و مغازی کی کتابوں میں آگئی ہیں۔ عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی جو ۶۳ھ میں واقعہ حرہ میں نذر آتش ہو گئی تھی، ان کے تلامذہ میں ابوالاسود یتیم عروہ نے آخر عمر میں مصر جا کر اس کی روایت کی۔ نیز دوسرے تلامذہ کے ذریعہ اس کی بہت سی روایات محفوظ ہیں۔ رواں صدی میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے عروہ بن زبیر کو مرویات کی ابوالاسود کی روایت سے یکجا کیا ہے اور ”مغازی عروہ بن زبیر“ کو دوباراً مرتب کر دیا ہے،

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عروہ بن زبیر کی مکمل کتاب اس میں یکجا ہوگئی ہے، تاہم اس کا بڑا حصہ محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابان بن عثمان کی کتاب المغازی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عتاب کی وجہ سے ضائع کر دی گئی۔ اور عام طور سے اس کی روایت بھی نہ ہو سکی، صرف مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی نے جرات کر کے اس کی روایت کی اور اپنے شاگردوں کو اس کے پڑھنے کی تاکید کی، کتب مغازی میں ابان بن عثمان کی گنی چنی چند روایتیں ملتی ہیں اور تتبع و تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کئی روایتیں ان کا نام لیے بغیر بیان کی گئی ہیں، اس اعتبار سے ابان بن عثمان بھی مظلوم ہیں۔ بعض مستشرقین اسی وجہ سے انہیں سیرت نگاروں کی صف میں شامل نہیں کرتے مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ نے سیرت ابن اسحاق کے محاکمہ میں ایک مستشرق و ستفلڈ کی کتاب ”مورخى العرب“ سے کم و بیش ۲۷ حضرات کے نام نقل کیے ہیں جو ابن اسحاق سے قبل اس فن میں اپنی جولانیاں دیکھا چکے تھے، ان میں ابان بن عثمان کا نام شامل نہیں ہے۔ و ستفلڈ کی اس فہرست میں ڈاکٹر حمید اللہ نے چھ ناموں کا اضافہ کیا ہے، جس میں پہلا نام ابان بن عثمان بن عفان کا ہے۔

محمد بن شہاب زہری کی کتاب المغازی کا اکثر و بیشتر حصہ ان کے تلامذہ نے اپنی کتابوں میں لے لیا ہے خاص طور سے موسیٰ بن عقبہ، محمد ابن اسحاق، اور معمر بن راشد اپنے استاد کی روایات کے امین ہیں نیز دوسرے علمائے سیر و مغازی نے بھی اپنی کتابوں میں زہری کی روایات کثرت سے لی ہیں اور معمر بن راشد کی روایات مصنف عبدالرزاق کی کتاب المغازی میں اس کثرت سے ہیں کہ گویا وہ ابن شہاب کی کتاب المغازی ہے۔

حال ہی میں دمشق کے ایک فاضل نے ابن شہاب زہری کی روایات جمع کر کے ”المغازی النبویہ“ کے نام سے شائع کر دی ہے۔ یہ کتاب دارالفکر دمشق سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب سوم، فصل دوم)

- ۱۔ مصطفیٰ سباعی 'حدیث رسول کا تشریحی مقام'، ص ۱۱۷ (مترجم غلام احمد حریری)۔
- ۲۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۴۱۔
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔
- ۴۔ عروہ بن زبیر، مغازی رسول اللہ، محقق و مرتب ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، (مترجم سعید الرحمن علوی)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
- ۵۔ جوزف ہوروتس 'سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین'، ص ۷۲۸ (مترجم نثار احمد فاروقی) مشمولہ نقوش، شمارہ ۱۳۰، رسول نمبر (ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۲ء)
- ۶۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۱۷۹۔
- ۷۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی' ص ۱۷۸۔
- ۸۔ فواد سیزگن 'سیرت نگاران نبوی'، ص ۹۱، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۳۳ء (مترجم شیخ نذیر حسین)۔
- ۹۔ انور محمد خالد اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۹۶-۹۵۔
- ۱۰۔ ذہبی 'سیر اعلام النبلاء' جلد ۶، ص ۱۵۰۔
- ۱۱۔ سخاوی، الاعلان بالتوخیخ، ص ۸۸۔
- ۱۲۔ حاجی خلیفہ 'کشف الظنون' جلد ۲، ص ۱۷۷۔
- ۱۳۔ دیکھئے "مغازی رسول اللہ" مرتب ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی، مترجم (محمد سعید الرحمن علوی) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
- ۱۴۔ ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۵، ص ۱۸۲۔
- ۱۵۔ ایضاً جلد ۵، ص ۱۵۶۔
- ۱۶۔ ابن الندیم 'الفہرست' ص ۷۶ (مترجم محمد اسحاق بھٹی) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور،

۱۹۹۰ء

- ۱۷۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی' ۱۸۱-۱۸۰۔
- ۱۸۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۸۲-۱۸۰۔
- ۱۹۔ البلاذری 'انساب الاشراف' جلد ۵، ص ۱۲۰۔
- ۲۰۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۸۳۔
- ۲۱۔ ابو ہاشم مغیرہ بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی مدنی کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے غالباً ۱۰۱ھ اور ۱۰۵ھ کے درمیان یا اس کے بعد ان کا انتقال ہوا انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے، ان کے تلامذہ میں محمد ابن اسحاق صاحب المغازی اور ان کے والد اسحاق بن یسار کے علاوہ امام مالک اور کئی اہل مدینہ ہیں، ان کا گھرانہ اشراف قریش سے تھا، سخاوت اور جہاد ان کے محبوب مشاغل تھے، کئی بار ملک شام جا کر جہاد میں شریک ہوئے، اسی میں ایک آنکھ بھی چلی گئی، علم المغازی میں اُبان بن عثمان کے خاص شاگرد تھے اور ان کی کتاب المغازی کی روایت کے ساتھ اس کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے، پڑھانے کی تاکید کرتے تھے۔ (اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۶-۱۹۵)۔
- ۲۲۔ ذہبی 'امام ابو عبد اللہ محمد' تذکرۃ الحفاظ' (مترجم محمد اسحاق) ص ۱۰۳ (اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۱ء)۔
- ۲۳۔ ایضاً۔
- ۲۴۔ ایضاً۔
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔
- ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔
- ۲۷۔ دوری، عبدالعزیز 'اسلامی تاریخ نگاری میں زہری کا حصہ'، ص ۱۰ مشمولہ نقوش، رسول

نمبر جلد ۹ شماره ۱۳، جنوری ۱۹۸۴ء (ادارہ فروغ اردو، لاہور)

۲۸۔ مبارک پوری، قاضی اطہر تدوین سیر و مغازی، ص ۱۸۸ (بحوالہ مصنف عبدالرزاق جلد ۵، ص ۳۴۳)

۲۹۔ خالد بن عبداللہ القسری، عراق کا گورنر تھا، وہ قبیلہ بجیلہ کی شاخ قسر سے تعلق رکھتا تھا، اس کی ماں عیسائی تھی۔ پہلے ولید بن عبدالملک نے اسے مکے کا گورنر بنایا ۸۹ھ / ۷۰۷ء یا ۹۱ھ / ۷۰۹ء میں۔ اور وہ اس عہدے پر ولید کی زندگی تک فائز رہا۔ ۹۶ھ / ۷۱۵ء میں سلیمان کی تخت نشینی پر وہ برخاست کر دیا گیا۔ تقریباً دس سال تک وہ سیاسی طور پر غیر فعال رہا یہاں تک کہ ۱۰۵ھ / ۷۲۲ء میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اسے عراق کا گورنر بنا دیا۔ اس نے واسط کو اپنا صدر مقام بنایا اور پندرہ سال تک بڑی کامیابی سے اپنے عہدہ پر جمارہا۔ سیاست میں وہ حجاج بن یوسف کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے برابر بے رحم نہ تھا تاہم وہ قوت اور مستقل مزاجی میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔ خلیفہ کے سامنے آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ بیرونی فتوحات کے مقابلے میں اپنے صوبے کی اندرونی حالت سدھارنے اور اقتصادی ترقی کی طرف اس کی توجہ زیادہ مبذول رہی۔ اس کے طویل دور حکومت میں عراق میں عام طور سے امن و آمان قائم رہا، زراعت اور تجارت نے ترقی کی، خود اسے ذاتی مفاد حاصل ہوتا رہا اور اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا۔ اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے اس نے کوفہ میں ایک گرجا بنوایا اور عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنے عبادت خانے تعمیر کرنے کی عام اجازت دے دی۔ زرتشتیوں کو سرکاری ملازمتیں دیں۔ بالآخر خالد اسی قیسی کلبی کشکش کا شکار ہو گیا جو اموی دور میں جاری تھی خالد سے قبل عراق کا گورنر عمر بن ہبیرہ قیسی تھا۔ جبکہ خالد یمنیوں کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ ہشام زیادہ دیر تک خالد کے دشمنوں اور قیسیوں کے دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکا اور ۱۲۰ھ / ۷۳۸ء میں خالد کو برطرف

کر کے ایک قیسی، یوسف بن عمر ثقفی کو گورنر مقرر کر دیا، جو اس سے قبل یمن کا گورنر رہ چکا تھا۔ خالد کو اس کے بعد نئے گورنر کی طرف سے قید و بند کی صوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اسے اذیتیں دے کر ۱۲۶ھ / ۷۴۳ء میں مار ڈالا گیا، وہ حیرہ میں دفن ہوا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۸، ص ۸۲۳ تا ۸۲۶، دانشگاه پنجاب، لاہور ۲۰۰۳ء)۔

۳۰۔ مبارک پوری، قاضی اطہر تدرین سیر و مغازی، ص ۱۸۷۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ فواد سیزگن، ص ۹۴۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۳۷۔ ان کے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن مسلم کا بیان ہے ”میں نے اپنے چچا زہری کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ علم المغازی آخرت اور دنیا میں کام آنے والا علم ہے۔“ (ابن کثیر، ’البدایۃ والنہایۃ‘ جلد ۳، ص ۲۴۱)۔

۳۸۔ ولیم میور 'The Life of Mohammad' (تعارف، ص ۷۶)۔

۳۹۔ عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ تابعی تھے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ’اشعر الفقہاء‘ یعنی اپنے زمانے کے فقہاء میں سب سے بڑے شاعر اور ’افقہ الشعراء‘ یعنی اپنے زمانے کے شعراء میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔ ان کا شمار ”فقہائے سبعہ مدینہ“ میں ہوتا تھا۔ قرآن، حدیث، سیرت، انساب اور زبان و ادب کے ماہر تھے، امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری ان کے تلمیذ خاص تھے۔

۴۰۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ڈاکٹر انور محمود خالد کی کتاب ’اردو نثر میں سیرت رسول‘ (اقبال

اکادمی پاکستان، لاہور)، ص ۱۰۲-۱۰۳۔

۳۱۔ مبارک پوری، اطہر تدوین سیر و مغازی، ص ۱۸۸ (بحوالہ تہذیب التہذیب، جلد ۱، ص ۲۶۲)۔

۳۲۔ ایضاً، ۱۸۹۔

۳۳۔ انور محمود خالد اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۱۰۴ (بحوالہ ڈاکٹر محمود الحسن عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز اور ارتقاء، ص ۴۹ تا ۵۳)۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ شبلی نعمانی 'سیرت النبی' جلد اول مقدمہ، ص ۱۹ (اعظم گڑھ، انڈیا)۔

۳۶۔ اطہر مبارک پوری، ص ۱۷۳۔

۳۷۔ سہیل شفیق 'ابن شہاب زہری بحیثیت سیرت نگار'، ص ۷۳ مشمولہ 'الایام' جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری۔ جون ۲۰۱۰ (مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی)۔



## دور اول کے دیگر راویان اور مصنفین سیرت

باب سوم کی دوسری فصل میں ایسے تین سیرت نگاروں کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا جنہوں نے مغازی پر اولین کتب تصنیف کیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کسی نے اور کچھ سیرت کے حوالے سے لکھا نہیں۔ فواد سیزگین نے اپنی جلیل القدر تصنیف ”تاریخ التراث العربی“ کی جلد دوم میں دور بنو امیہ کے کم از کم انیس سیرت نگاروں (بشمول عروہ بن زبیر، أبان بن عثمان اور ابن شہاب زہری) کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے سیرت و مغازی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھا اس میں مدینہ سے باہر کے چند سیرت نگار بھی شامل

ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ سعید بن سعد بن عبادہ

۲۔ سہل بن ابی حشمہ

۳۔ سعید بن مسیب

۴۔ عبید اللہ ابن کعب

۵۔ عامر بن شراحیل شععی

۶۔ أبان بن عثمان

۷۔ عروہ بن زبیر

۸۔ شریحیل بن سعید

۹۔ قاسم بن محمد

۱۰۔ عاصم بن عمر بن قتادہ

۱۱۔ ابن شہاب زہری

۱۲۔ عمرو بن عبداللہ السبعی

۱۳۔ یعقوب بن عقبہ

۱۴۔ عبداللہ بن ابی بکر

۱۵۔ یزید بن رومان

۱۶۔ ابوالاسود

۱۷۔ داود بن حسین

۱۸۔ سلیمان بن طرخان

۱۹۔ موسیٰ بن عقبہ

تاہم اس فہرست میں کم از کم ایک سیرت نگار کا اضافہ کیا جاسکتا ہے یہ جعفر بن محمود انصاری تھے۔ جو ابن شہاب زہری کے ہم عصر تھے، اور ان کی ”کتاب الغزوة“ کے بارے میں یحییٰ بن معین کا بیان ملتا ہے۔

پچھلی فصل میں تین مصنفین کا تفصیلی تذکرہ آگیا ہے یعنی ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر اور محمد ابن شہاب زہری۔ باقی سیرت نگاروں کا احوال یہاں بیان کیا جاتا ہے، تاکہ دور اول (جسے آسانی کی خاطر دور بنو امیہ بھی کہا جاسکتا ہے) کی پوری تصویر کشی ہو سکے اور سیرت نگاری کا آغاز پورے طور پر سمجھا جاسکے۔

## ۱۔ سعید بن سعد بن عبادہ الخزرجی

سعید بنو خزرج کے مشہور سردار سعد بن عبادہ کے بیٹے تھے۔ ابن سعد، سعید کو صحابی سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق سعید بن سعد نے رسول اللہ کی صحبت کا شرف پایا ہے، بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے رسول اللہ سے سنا بھی ہے، ثقہ اور قلیل الحدیث تھے

۱۔ جبکہ فواد سیزگین کہتے ہیں کہ ہماری معلومات کے مطابق حضرت سعید رسول اللہ کے زمانہ حیات میں پیدا ہوئے لیکن شرف ملاقات سے مشرف نہ ہو سکے ۲ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعید نے اوائل عمری سے ہی آپ کی زندگی کے واقعات لکھنے شروع کر دیئے تھے اور اپنے والد کے طرز تحریر سے کچھ اختلاف بھی کیا تھا، ان کی کتاب اوائل عہد عباسی تک ان کے پوتے سعید بن عمرو کے پاس محفوظ تھی۔ ۳ اس کتاب کے بعض حصے مسند احمد بن حنبل، اور مسند ابی عوانہ میں پائے جاتے ہیں۔ حضرت سعید کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ حضرت سعید کے بیٹے شریحیل بھی صاحب کتاب المغازی تھے، ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

## ۲۔ سہل بن ابی حمزہ (م ۴۱ھ / ۶۶۱ء)

مدنی اور انصاری تھے۔ ان کا لقب ابو یحییٰ یا ابو محمد تھا وہ ۳ھ / ۶۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوائل شباب ہی میں رسول اللہ کی سوانح حیات اور ان کی مغازی کی تدوین و تالیف میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی مغازی کا نسخہ ان کے پوتے یا پڑپوتے محمد ابن یحییٰ بن سہل کے پاس تھا۔ ان میں سے بعض حصے الواقدی کی المغازی میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اقتباسات البلاذری کی ”انساب الاشراف“ بطبری کی تاریخ اور طبقات ابن سعد میں بھی ملتے ہیں۔ سہل بن ابی حمزہ نے حضرت امیر معاویہ کے عہد امارت میں ۴۱ھ / ۶۶۱ء میں وفات پائی۔ ان سے ان کے بیٹے محمد، بھانجے محمد بن سلیمان، بشیر بن یسار الانصاری، نافع بن جبیر بن مطعم اور عروہ بن زبیر وغیرہ نے روایت کی ہے، زہری کو ان سے براہ راست روایت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی احادیث مسند احمد میں ملتی ہیں۔ ۴

## ۳۔ سعید ابن مسیب (م ۹۴ھ / ۷۱۳ء)

شیخ الاسلام، ابو محمد سعید ابن مسیب بن حزن ۵ قریش کے قبیلہ بنو مخزوم سے

تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عمر کے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے دو سال بعد پیدا ہوئے۔ اکابر تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے، فقیہ مدینہ تھے، وسعتِ علم میں شاید کوئی تابعی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ نے عموماً حضرت عثمان، زید بن ثابت، ام المومنین حضرت عائشہ، سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، اور دوسرے صحابہ سے اکتسابِ علم کیا، آپ حضرت ابو ہریرہ کے داماد تھے۔ رسول اللہ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے فیصلوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے اکثر ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی راتوں اور کئی کئی دن سفر کیا ہے۔ ماہرِ انساب مورخ، محدث اور فقیہ تھے اور حضرت عمر فاروق کی فقہ پر اعتماد کرتے ہوئے فتاویٰ دیا کرتے تھے، اس لیے ان کو حضرت عمر کا راوی کہا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں الزہری، قتادہ، حضرت عمر کے پوتے محمد بن عبداللہ اور سالم وغیرہ شامل ہیں۔

خلفائے بنو امیہ سے آپ کے تعلقات اچھے نہیں تھے، آپ ان حکمرانوں اور امراء کے سخت ناقد تھے، ۸۴ھ میں جب عبدالعزیز بن مروان کی وفات مصر میں ہو گئی تو خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنایا اور تمام شہروں میں ان دونوں کی بیعت کے لیے لکھ دیا اس زمانے میں مدینہ کا عامل ہشام بن اسماعیل مخزومی تھا، اس نے سب سے بیعت لی اور جب سعید بن مسیب کو بلایا تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک میں غور نہ کر لوں، بیعت نہ کروں گا۔ اس پر ہشام نے انہیں ساٹھ کوڑوں کی سزا دی، کسبل میں باندھ کر انہیں گشت کراتے رہے اور بالاخر قید خانے میں ڈال دیا۔ عبدالملک بن مروان کو اطلاع ہوئی تو اس نے رہائی کا حکم دیا۔ اس سے قبل واقعہ حرہ (۶۳ھ) میں مسلم بن عقبہ المعری کی پکڑ دھکڑ سے بہ مشکل ان کی جان بچی تھی، ایک وقت یہ بھی آیا تھا کہ مسجد نبوی میں یہ تنہا بیٹھے رہتے تھے، ان کے پاس جانے کی اموی حکام کی طرف سے مخالفت ہو گئی تھی۔ اسی طرح عبداللہ ابن

زیر سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے، جبکہ وہ خلیفہ تھے۔ جابر بن اسود حضرت عبداللہ بن زبیر کی جانت سے مدینے کے گورنر تھے انہوں نے سعید بن مسیب کو عبداللہ ابن زبیر کی بیعت کے لیے بلایا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ جابر نے ان کو ساٹھ کوڑے لگوائے ۱۲ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کسی اموی خلیفہ نے آپ کے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا، حضرت عمر بن عبدالعزیز جب تک سعید ابن مسیب سے دریافت نہ کر لیتے اپنا کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔ ۱۳

آپ کا انتقال ۹۴ھ میں ہوا، اس سال کو کثرت سے فقہا کا انتقال ہونے کی

وجہ سے، ”سنة الفقہاء“ کہا جاتا ہے۔ یہ ولید بن عبدالملک کا دور خلافت تھا۔ ۱۴

مغازی، فتوح اور سیرت نبوی پر آپ کی کتاب موجود تھی جس سے بعد میں طبری نے بہت استفادہ کیا ہے، تاہم فواد سیزگین یہ نہیں بتاتے کہ سعید نے اپنی کتاب یا کتابیں کب لکھی تھیں ۱۵ ہو سکتا ہے اموی خلفاء کی ناراضگی اور مزاحمت کی وجہ سے آپ کی کتاب المغازی کی زیادہ روایت نہ کی گئی ہو، اس وقت تک عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان کی کتاب المغازی لکھی جا چکی تھیں۔

## ۴۔ عبید اللہ ابن کعب (م ۹۷ھ / ۷۱۵ء)

ابو فضالہ عبید اللہ بن کعب بن مالک الانصاری متقدمین تابعین میں سے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جبکہ خود ان سے امام زہری اور ان کے بھائی معبد بن کعب وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ اکابر علمائے انصار سے ہیں اور بعض نامور مؤلفین مغازی ان پر اعتماد کرتے ہیں، تاریخ طبری میں ان کے جو اقتباسات ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن کعب نے مغازی پر کتاب لکھی تھی تاہم ان کی کتاب المغازی زیادہ ضخیم نہیں تھی۔ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے عبید اللہ بن کعب کی کتاب المغازی

سے بھی استفادہ کیا تھا ۱۶ ابن سعد کے مطابق وہ ثقہ اور قلیل الروایت تھے ۱۷۔

## ۵۔ قاسم بن محمد (م ۱۰۷ھ / ۷۲۵ء)

ابو محمد، قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق ۳۷ھ / ۶۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ام ولد تھیں جن کا نام سودہ تھا ۱۸ وہ عروہ بن زبیر کی طرح اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ الشعمی اور امام زہری ان کے راویوں میں سے ہیں۔ ان کا حلقہ درس مسجد نبوی میں تھا۔ جہاں عموماً عشاء کے بعد مجلس لگتی تھی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ان کے بعد عبدالرحمن بن قاسم اور عبید اللہ ابن عمر کا حلقہ درس لگتا تھا اور ان کے بعد مالک بن انس کا حلقہ درس اسی جگہ منعقد ہوتا تھا، یہ جگہ قبر اور منبر کے درمیان حضرت عمرؓ کی کھڑکی کے روبرو تھی ۱۹ آپ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ، ابن عباس، معاویہ، فاطمہ بنت قیس، ابن عمر اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے علم حدیث حاصل کیا، اور آپ سے آپ کے بیٹے عبدالرحمن، زہری، ابن المنکدر، ابن عون، ربیعۃ الرای، فلح بن حمید، حنظلہ بن ابوسفیان، ایوب اور دوسرے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔ اپنے والد محمد بن ابی بکر کے قتل ہونے کے بعد اپنی پھوپھی ام المومنین حضرت عائشہ کی گود میں بحالت یتیمی پرورش پائی اور انہی سے فقہ اور حدیث سیکھا۔ ۲۰

یحییٰ بن سعید انصاری کہتے ہیں مدینہ میں کوئی عالم ایسا نہیں ہے جسے ہم قاسم پر برتری دیں۔ ابوالزناد کہتے ہیں، میں نے قاسم سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی فقیہ نہیں دیکھا ہے اور نہ ان سے زیادہ حدیث کا علم رکھنے والا کوئی انسان معلوم ہے، سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ قاسم اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز کہتے تھے اگر میرا اختیار ۲۱ ہوتا تو اپنے بعد بنو تیم کے ”اعمش“ (یعنی قاسم بن محمد) کو خلیفۃ المسلمین نامزد کرتا۔ ۲۲

آخر عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی انہوں نے ۱۰۷ھ مطابق ۷۲۵ء

انتقال کیا۔ ان کا انتقال قدید میں ہوا اور تدفین مثلث میں ہوئی ۲۳ اس وقت وہ ستر یا بہتر برس کے تھے۔

قاسم بن محمد ثقہ، اور عالی مرتبہ فقیہ و امام تھے، کثیر الحدیث اور متقی تھے ۲۴ سیر و مغازی پر انہوں نے کتاب مرتب کی تھی، طبری نے قاسم بن محمد کی کتاب سے بہت سی عبارتیں اپنی تاریخ میں دی ہیں۔ اس کے علاوہ فہرست تاریخ الطبری میں پچیس بار قاسم بن محمد کی کتاب المغازی کا حوالہ آیا ہے۔ ان میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عثمان بن عفان کے عہد خلافت کے واقعات کے علاوہ جنگ جمل کا بھی ذکر ہے۔ یہ واقعات سہل بن یوسف السلمی کے واسطے سے قاسم بن محمد کی مغازی سے ماخوذ ہیں۔ بعض عبارتیں واقدی اور بلاذری نے بھی نقل کی ہیں۔ ۲۵

## ۶۔ عاصم بن عمر بن قتادہ (م ۱۲۰ھ / ۷۳۷ء)

ابو عمر عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان انصاری مشہور تابعی ہیں، ان کے دادا حضرت قتادہ بن نعمان جلیل القدر صحابی تھے۔ عاصم بن عمر سیر و مغازی کے امام تھے ۲۶ ابن سعد نے بھی ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حدیث کے راوی تھے اور ان کو سیرت اور مغازی کا علم تھا۔ ان کے تلامذہ میں دو مشہور سیرت نگار شامل تھے ایک محمد ابن اسحاق اور دوسرے ابو الاسود یتیم عروہ۔ ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے ”وہ محمد ابن اسحاق کے استاد ہیں اور اخبار کے عالم اور مغازی کے علامہ ہیں۔“ ۲۷ امام زہری کے نزدیک محمد ابن اسحاق کے واسطے سے عاصم بن عمر کی مغازی کی روایات نہایت مستند تھیں اور وہ ان کو فوراً قبول کر لیتے تھے۔ ۲۸

سیر و مغازی میں تہجرت و ثقاہت کی وجہ سے اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ان کو حکم دیا کہ وہ دمشق کی جامع مسجد میں مغازی اور مناقب صحابہ بیان کیا کریں اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی ۲۹ جب آپ مدینہ واپس آئے تب بھی مغازی کا درس دینے کا

سلسلہ جاری رکھا۔ الفرید گیام نے گمان ظاہر کیا ہے کہ عاصم بن عمر نے اپنے خطبات مغازی قلمبند بھی کیے ہوں گے۔ ۳۰

امام المغازی، محمد ابن اسحاق کی عاصم بن عمر سے مدینہ میں ملاقات ہوئی اور وہ جب تک وہاں رہے پابندی سے عاصم کے درس میں شرکت کرتے رہے اسی لیے ابن اسحاق نے ان کی مغازی کے متعدد حصے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ ابن اسحاق کے علاوہ واقدی نے بھی ان سے خاص طور پر مغازی کی روایات اخذ کی ہیں۔ ابن جریر طبری نے ۴۱ مقامات پر عاصم کا تذکرہ کیا ہے ان کی ابتدائی روایات کا تعلق رسول اللہ کے زمانہ شباب، مکی زندگی، بعثت اور آغاز اسلام سے ہے عاصم بن عمر کا درس سن کر لوگوں نے اپنی بیاضوں میں سیرت و مغازی کے واقعات جمع کرنے شروع کر دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بیاضیں، سیرت نبوی کے خام مواد کے طور پر آئندہ مؤلفین کے بے حد کام آئیں اور ان کی حیثیت ابتدائی ماخذ کی ہو گئی۔ ۳۱

## ۷۔ جعفر بن محمود انصاری مدنی

اسی زمانے میں مدینہ میں غزوات کے موضوع پر ایک اور کتاب کا ذکر ملتا ہے جس کو جعفر بن محمود بن عبد اللہ بن محمد بن سلمہ حارثی انصاری مدنی نے لکھا تھا۔ وہ علمائے تابعین کے طبقہ اولیٰ میں سے ہیں، حضرت اُسید بن حضیر سے مرسل روایت کی ہے، نیز حضرت جابر بن عبد اللہ اور اپنی دادی تویلہ بنت اسلم صحابیہ سے روایت کی، اور ان سے ان کے بیٹے ابراہیم بن جعفر، بھتیجے سلیمان بن محمد بن محمود، موسیٰ ابن عمیر انصاری نے روایت کی ہے۔ ۳۲

جعفر بن محمود حدیث وفقہ اور سیر و مغازی کے عالم تھے، انہوں نے ”کتاب الغزوة“ لکھی تھی جو اہل علم کے نزدیک مستند تھی اور وہ اپنے شاگردوں کو اس کی روایت کی ترغیب دیتے تھے۔ یحییٰ بن معین کا بیان ہے ”صالح بن کیسان نے جعفر بن محمود کی



روایت سے کتاب الغزوه پڑھنے کا حکم دیا تھا۔“ ۳۳ صحیح بن کیسان مدنی (م ۱۴۰ھ) امام زہری کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی زیارت کا شرف رکھتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اولاد کے مودب و معلم تھے، حدیث و فقہ کے جامع عالم تھے، ان کے امر و حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفر بن محمود انصاری کی کتاب الغزوه اہم کتاب رہی ہوگی۔ جس کی روایت ان سے اہل علم کرتے تھے اور اس کا حکم دیتے تھے، ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔ ۳۴ تاہم فواد سیزگین ان کا نام اس عہد کے مؤلفین سیرت و مغازی میں نہیں دیتے۔

## ۸۔ شرجیل بن سعد (م ۱۲۳ھ / ۷۴۰ء)

ابو سعد شرجیل بن سعد انصاری مدنی سیر و مغازی کے مشہور عالم تھے ان کا شمار شیوخ مدینہ میں ہوتا تھا۔ کبار صحابہ سے روایت کی ہے ان کے تلامذہ میں محمد ابن اسحاق اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس علمائے مغازی میں سے ہیں۔ کبرسنی کی وجہ سے ۷۰ عمر میں حواس مختل ہو گئے تھے، اس لیے ان کی روایت میں کلام کیا گیا ہے مگر ان کے علم المغازی میں کلام نہیں ہے، ابن ابی حاتم نے لکھا ہے ”وہ مغازی کے عالم تھے“ ۳۵ خاص طور سے شرکائے بدر کے علم میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ حضرت شرجیل نے غزوه بدر میں شریک ہونے والے مہاجرین کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی۔ سفیان بن عیینہ نے ان کو مغازی کے جلیل القدر عالموں میں شمار کیا ہے ۳۶ اگرچہ ابن اسحاق اور واقدی نے ان سے کوئی روایت نہیں لی لیکن ابن سعد نے طبقات میں ہجرت رسول اللہ کے بارے میں ان سے ایک روایت درج کی ہے۔ ان کے بارے میں الفریڈ گیام کہتے ہیں ”ہمیں ان کے بارے میں سوائے اس کے کہ انہوں نے بھی فن مغازی پر ایک کتاب لکھی تھی اور کچھ معلوم نہیں۔“ ۳۷ تقریباً سو سال عمر پا کر ۱۲۳ھ میں انتقال کیا۔

## ۹۔ یعقوب بن عتبہ (م ۱۲۸ھ / ۷۴۵ء)

یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ الثقفی المدنی، امام زہری کے معاصر تھے۔ نہایت ثقہ تھے عمال اور گورنر، انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا۔ سیرت نبوی کے عالم تھے۔ ان کا دادا اخنس بن شریق ثقفی رسول اللہ کا بہت بڑا دشمن تھا ۳۸ سیرت پر ان کی تحریریں تھیں۔ تاریخ طبری میں یعقوب بن عتبہ کی سیرۃ کے بہت سے اقتباسات ہیں ۳۹ انہوں نے ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔

## ۱۰۔ عبداللہ بن ابی بکر: (م ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ)

عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری ۵۶ھ یا ۶۰ھ / ۶۷۹ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بنونجار سے تھا۔ یہ بھی مغازی کے ابتدائی مصنفین میں سے ہیں۔ ان کے جد اعلیٰ حضرت عمرو بن حزم انصاریؒ کو رسول اللہ نے نجران کا امیر بنا کر ان کے نام ایک مفصل مکتوب روانہ فرمایا تھا۔ ان کا خاندان حدیث و فقہ اور سیر و مغازی میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔

عبداللہ کے والد قاضی ابوبکر جو اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث، امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بطور خاص احادیث جمع کرنے کا حکم بھیجا تھا انہوں نے یہ لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمن ۴۰ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیجیں۔ ۴۱ انہی قاضی ابوبکر کے بیٹے عبداللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تابعین کے بعد تین ایسے علماء سامنے آئے جنہیں مغازی سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی حدیث سے ان میں عاصم بن عمر، ابن شہاب زہری کے ساتھ تیسرا نام عبداللہ بن ابوبکر کا ہے۔ ۴۲

عبداللہ بن ابوبکر نے اپنی کتاب المغازی میں عرب قبائل کے ان وفود کے

بارے میں خاص مواد فراہم کیا ہے جو رسول اللہ کی خدمت میں آئے، نیز رسول اللہ کی وفات کے بعد قبائل عرب کے ارتداد کے اخبار کی روایت کی ہے۔ ۴۳

عبداللہ اپنی بیشتر روایات میں اسناد کا اہتمام نہیں کرتے کیونکہ انہوں نے جن لوگوں سے روایات اخذ کیں وہ واقعات کے قریبی گواہ تھے ۴۴ عبداللہ نے غزوات نبوی کی فہرست، تاریخی ترتیب کے ساتھ تیار کی تھی جو ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ انہوں نے لکھی ہوئی کتابوں اور دستاویزات کی طرف بھی توجہ دی مثلاً وہ خط جو رسول اللہ نے ملوک حمیر کو بھیجا تھا۔ یا وہ دستاویز جو رسول اللہ نے ان کے پردادا حضرت عمر بن حزم کو ساتھ رکھنے کے لیے اس وقت دی تھی جب انہیں اہل نجران کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے روانہ کیا تھا۔ عبداللہ بن ابی بکر کے شیوخ میں عروہ بن زبیر اور ابن شہاب زہری ہیں جبکہ محمد ابن اسحاق ان کے شاگرد ہیں، ابن اسحاق نے اپنی ”کتاب المغازی“ میں ان کی بہت سی روایات درج کی ہیں۔

عبداللہ کے ایک بھتیجے عبدالملک بن محمد بن ابو بکر (م ۱۷۶ھ) نے ان سے کتاب المغازی کی روایت کی ہے۔ وہ نہایت ثقہ، صادق، مامون، حجت، حافظ حدیث، فقیہ اور سیر و مغازی کے عالم و مصنف تھے، انہوں نے اپنے چچا کی کتاب المغازی کی روایت بغداد میں کی۔ ۴۵ خود بھی ایک ’کتاب المغازی‘ کے مولف تھے۔ ۴۶ عبداللہ بن ابو بکر کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۱۳۵ھ میں ہوا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

## ۱۱۔ یزید بن رومان: (۱۳۰ھ/۷۴۷ء)

یزید بن رومان الاسدی مدنی، ابوروح، آل زبیر بن العوام کے مولیٰ تھے ۴۷۔ ان کا شمار متاخرین تابعین میں ہوتا ہے اگرچہ انہوں نے صحابہ کرام سے روایت نہیں کی۔ وہ محدث اور مغازی کے مولف تھے۔ ان کی روایات کا مدار عروہ بن زبیر اور ابن شہاب زہری کے اقوال ہیں، لیکن خود ان سے محمد ابن اسحاق، اور حضرت مالک بن انس اور

ہشام بن عروہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن رومان کی کتاب المغازی، محمد ابن صالح بن دینار (م ۱۶۸ھ / ۷۸۴ء) کی روایت سے واقدی کی دسترس میں تھی۔ طبقات ابن سعد میں بھی اس کے اقتباسات ملتے ہیں۔ طبری نے ابن سعد، واقدی اور ابن اسحاق کے حوالے سے یزید بن رومان کی مغازی کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں۔ انہوں نے ۱۳۰ھ / ۷۴۷ء میں وفات پائی۔ ۴۸

## ۱۲۔ ابوالاسود: (م ۱۳۷ھ / ۷۵۴ء)

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل اسدی مدنی کی 'کتاب المغازی' درحقیقت عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کا نسخہ ہے جس میں ابوالاسود نے دوسرے شیوخ کی روایتیں شامل کر دی ہیں۔ ابوالاسود کے والد عبدالرحمن بن نوفل، حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ شہید ہو گئے تھے، انہوں نے اپنے بچے کو عروہ بن زبیر کی کفالت میں دینے کی وصیت کی تھی، عروہ نے ان کو اپنی تعلیم و تربیت میں یوں رکھا کہ وہ "یتیم عروہ" کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ دونوں کا شجرہ نسب اوپر جا کر خویلد بن اسد سے مل جاتا ہے۔ نہایت کثیر الحدیث اور ثقہ عالم ہیں ۴۹۔ ابوالاسود تابعی ہیں ۵۰۔ انہوں نے عروہ بن زبیر کے علاوہ علی بن حسین زین العابدین، سلیمان ابن یسار، عامر بن عبداللہ بن زبیر، سالم مولی شداد، سالم بن عبداللہ بن عمر، عبدالرحمن الاعرج، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، نعمان بن ابو عیاش، اور یحییٰ بن نصر وغیرہ سے روایت کی تھی۔ ۵۱

ابوالاسود بنی امیہ کے آخری دور میں مصر چلے گئے تھے، جہاں ان کے علم کی بڑی اشاعت ہوئی، انہوں نے عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کی مصر میں روایت کی ۵۲۔ ان کے مصری تلامذہ میں لیث ابن سعد، ابو شریح عبدالرحمن بن شریح اسکندرانی، عبداللہ بن لہیعہ مشہور ہیں۔ اہل علم کے نزدیک ابوالاسود کی روایات قابل وثوق ہیں۔ ابوالاسود کی کتاب المغازی سے منتخبات، البلاذری کی کتاب انساب الاشراف، طبری، ابن حجر کی

الاصابہ اور ابن سعد کی طبقات میں ملتے ہیں۔ ۵۳۔

### ۱۳۔ داود بن الحسین: (م ۱۳۵ھ / ۷۵۲ء)

ابوسلیمان داود بن الحسین الاموی، عکرمہ اور نافع وغیرہم کے شاگرد اور امام مالک اور ابن اسحاق کے شیخ تھے۔ اپنے استاد عکرمہ کی طرح خوارج کی طرف مائل تھے۔ بعض محدثین نے ان کی روایات کی تضعیف کی ہے جبکہ بعض نے ان کی توثیق کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف حیات النبیؐ اور صحابہ کرام کے حالات جمع کرنے کا ہی اہتمام کیا تھا۔ ۵۴۔

### ۱۴۔ موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ / ۷۵۸ء)

مدینہ کے سیرت نگاروں میں جنہوں نے عہد بنو امیہ (۳۱ھ تا ۱۳۲ھ) میں کتب مغازی لکھیں ان میں آخری نام موسیٰ بن عقبہ کا لیا جاسکتا ہے۔ ان کا انتقال عہد عباسی میں ہوا، لیکن انہوں نے اپنی کتاب المغازی عہد بنو امیہ میں تالیف کر لی تھی۔ ۵۵۔

ابو محمد موسیٰ بن عقبہ اسدی امام زہری کے شاگرد تھے۔ یہ تین بھائی تھے محمد بن عقبہ، ابراہیم بن عقبہ اور موسیٰ بن عقبہ، تینوں بھائی مدینہ کے مشہور فقہاء و محدثین میں تھے۔ ان کا حلقہ درس مسجد نبوی میں الگ الگ قائم ہوتا تھا۔ سب سے چھوٹے موسیٰ بن عقبہ کثیر الحدیث اور فقہ و فتویٰ میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مولیٰ زبیر بن عوام تھے ۵۶۔

موسیٰ بن عقبہ نے سیرۃ و مغازی کے علم میں عبداللہ بن عباس کی کتابوں سے استفادہ کیا، جن کو ان کے غلام کریب نے ان کے پاس رکھوایا تھا۔ انہوں نے آخری عمر میں کتاب المغازی تصنیف کی اور اس حوالے سے تحقیق و تلاش کا خاص اہتمام کیا۔ امام مالک کے شاگرد جب ان سے دریافت کرتے کہ ہم کس عالم سے مغازی کی روایت کریں تو کہتے تم لوگ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی پڑھو، وہ ثقہ ہیں ۵۷ امام مالک اپنے

شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ مغازی موسیٰ بن عقبہ سے حاصل کرو، وہ ثقہ اور مردِ صالح ہیں ان کی مغازی اصح المغازی ہے، انہوں نے بڑھاپے میں یہ علم حاصل کیا ہے۔ دوسروں کی طرح تکثیر روایت سے کام نہیں لیا۔

امام احمد بن حنبل تفسیر، ملاحم و مغازی کو بے اصل کہتے ہیں مگر مغازی موسیٰ بن عقبہ کے بارے میں ان کا قول ہے ”تم لوگ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی حاصل کرو وہ ثقہ ہیں“ ۵۸۔ حافظ ابن حجر نے ان کی مغازی کو ”اصح المغازی“ بتایا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی دراصل ان کے شیخ ابن شہاب زہری کی کتاب المغازی کا مثنیٰ ہے جس کو انہوں نے آخری عمر میں مزید تحقیق و تلاش کے بعد مرتب و مدون کیا ہے۔ اس کتاب کی روایت موسیٰ کے کئی شاگردوں نے کی جن میں ان کے بھتیجے اسمعیل بن ابراہیم بن عقبہ اس کے مشہور و مخصوص راوی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد بن فلج اور سلیمان بن بلال تیمی نے بھی اس کتاب کی روایت کی ہے۔ نویں صدی ہجری تک مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت محدثین میں ہوتی رہی ہے۔ مشہور مستشرق سخا نے مغازی موسیٰ بن عقبہ کا انتخاب برلن کے ایک مخطوطہ سے شائع کیا تھا، اس کا ایک حصہ کتاب الامالی ابن صاعد میں پایا جاتا ہے اور سیرت کی کتابوں میں اس کی روایات موجود ہیں جن میں اکثر محمد ابن شہاب زہری سے مروی ہیں۔ ۵۹

مورخ کی حیثیت سے موسیٰ بن عقبہ کی تمام تر توجہ کا مرکز مغازی رسول اللہ اور خلفائے راشدین تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مہاجرین حبشہ اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والوں کے اسمائے گرامی بھی تحریر کیے تھے۔ انہوں نے چند مواقع پر امویوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنہ وار تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں، ان کے بہت سے پیش رو جن میں عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (متوفی ۱۲۰ھ / ۷۳۷ء) بھی شامل ہیں سنین کا التزام کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ میں اشعار سے

شاذو نادر استشهد کرتے ہیں۔ ۶۰۔

موسیٰ بن عقبہ کی اصل کتاب تو ضائع ہو چکی ہے، اس کا ایک ٹکڑا برلن میں تھا جس کا جرمن ترجمہ سخاو (زخاؤ) نے شائع کیا ہے۔ یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر (م ۳۶۳ھ / ۱۰۷۱ء) نے اس کا اختصار 'کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر کے نام سے کیا تھا، جو چھپ گیا ہے، حافظ ابن حجر نے کتب المغازی سے بے شمار اقتباسات الاصابہ میں دیئے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ جناب مصطفیٰ الاعظمی نے بیروت سے شائع کیا ہے۔ ۶۱۔

اس تذکرہ سے مدینہ منورہ میں سیرت نگاری کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ دیگر شہروں میں سیرت پر کوئی کام دور اول میں نہیں ہوا۔ کوفہ، بصرہ اور یمن میں اسی دور میں سیرت پر ابتدائی کتابیں لکھی گئیں جن کا تذکرہ باب چہارم میں کیا جا رہا ہے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب سوم، فصل سوم)

- ۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۸۳ (دارصادر، بیروت، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء)
- ۲۔ فواد سیزگن 'سیرت نگاران نبوی' مترجم شیخ نذیر حسین، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اگست ۹۳ء، ص ۸۶۔
- ۳۔ ایضاً۔
- ۴۔ ایضاً، ص ۸۷۔
- ۵۔ سعید بن مسیب بن حزن سے مروی ہے کہ ان کے دادا حزن، رسول اللہ کے پاس آئے آپ نے فرمایا تمہارا نام کیا ہے؟ عرض کی حزن (سخت زمین) فرمایا نہیں تم سہل (نرم زمین) ہو، عرض کی یا رسول اللہ میرا جو نام والدین نے رکھا ہے میں اسی سے لوگوں میں مشہور ہو گیا، رسول اللہ خاموش ہو گئے، سعید ابن مسیب نے کہا کہ پھر ہم برابر اپنے خاندان میں حزنونہ (سخت) محسوس کرتے ہیں (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۱۹) اسی قسم کی تفصیل معمولی فرق سے ابن قتیبہ کی کتاب المعارف، ص ۳۶۳، مترجم علی محسن صدیقی میں دیکھی جاسکتی ہے۔
- ۶۔ آپ کی جلالت علمی کے لیے دیکھئے امام ابو عبد اللہ محمد الذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۶۲ تا ۶۴ مترجم محمد اسحاق (اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۱ء)
- ۷۔ ابن قتیبہ الدینوری، کتاب المعارف، ص ۱۹۳۔
- ۸۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۶۳۔
- ۹۔ طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۱۲۰۔
- ۱۰۔ ایضاً، جلد ۵، ص ۱۲۲۔
- ۱۱۔ ایضاً۔
- ۱۲۔ المعارف، ص ۱۹۳۔



- ۱۳۔ طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۱۲۰۔
- ۱۴۔ ایضاً، جلد ۵، ص ۱۴۰۔
- ۱۵۔ فواد سیزگن، ص ۸۸۔
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۸۸۔
- ۱۷۔ طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۲۷۱۔
- ۱۸۔ ایضاً، جلد ۵، ص ۱۸۷۔
- ۱۹۔ ایضاً، جلد ۵، ص ۱۸۸۔
- ۲۰۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۹۵۔
- ۲۱۔ اختیار نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پیش رو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بعد عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ اور ساتھ ہی اپنے بھائی یزید بن عبدالملک کو ولی عہد نامزد کیا تھا۔
- ۲۲۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۹۵۔
- ۲۳۔ قدید اور مُثلل کے درمیان تین میل کا فاصلہ ہے یہ دونوں علاقے مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے راستہ میں پڑتے ہیں، مثلل ہی میں مسلم بن عقبہ المعمری کا بھی مدفن ہے جہاں لوگ سنگ باری کرتے ہیں۔
- ۲۴۔ طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۱۹۴۔
- ۲۵۔ فواد سیزگن، ص ۹۳۔
- ۲۶۔ ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۰۵۔
- ۲۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۹۸۔
- ۲۸۔ ایضاً۔
- ۲۹۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز احادیث رسول کو جمع کرانے اور سیرت صحابہ کرام کو قلمبند

کرانے میں بہت مستعد تھے، انہوں نے سالم کو بھی لکھا تھا کہ وہ حضرت عمر فاروق کی سیرت لکھیں (دیکھئے طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۳۹۶، دارصادر، بیروت، ۱۹۸۵ء)۔

۳۰۔ خالد، انور محمود اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۹۹ (بحوالہ "The A Gullaume Life of Mohammad" تعارف، ص XV)

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ مبارک پوری، قاضی اطہر تدمین سیر و مغازی، ص ۱۹۰۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔

۳۶۔ ایضاً (بحوالہ ابن حجر، تہذیب التہذیب جلد ۴، ص ۳۲۱)

۳۷۔ خالد، انور محمود اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۱۰۰ (بحوالہ الفرید گیام، لائف آف محمد، تعارف، ص XV)۔

۳۸۔ شبلی نعمانی 'سیرت النبی' مقدمہ، ۲۹۔

۳۹۔ فواد سیزگن، ص ۹۹، نیز قاضی اطہر مبارک پوری، ص ۲۰۰۔

۴۰۔ عمرہ بنت عبدالرحمن ایک خاتون تھیں جنہیں حضرت عائشہ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، حضرت عائشہ کی اس تعلیم و تربیت کے نتیجے میں وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ بنیں۔ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ قاضی ابو بکر بن حزم انصاری، انہی عمرہ کے بھانجے تھے (شبلی نعمانی 'سیرت النبی' مقدمہ، ص ۲۰)

۴۱۔ شبلی نعمانی 'سیرت النبی' مقدمہ، ۲۰۔

۴۲۔ خالد، انور محمود اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۱۰۵۔

- ۴۲۔ ایضاً۔  
۴۳۔ ایضاً۔  
۴۵۔ مبارک پوری، قاضی اطہر تّدوین سیر و مغازی، ص ۱۹۱  
۴۶۔ شبلی نعمانی 'سیرت النبی' مقدمہ، ۳۱۔  
۴۷۔ ابن خلکان 'وفیات الاعیان و انباء الزمان' مترجم علامہ اختر فتح پوری جلد ۶، ص ۳۲۰۔  
۴۸۔ فواد سیزگن، ص ۱۰۰۔  
۴۹۔ مبارک پوری، قاضی اطہر تّدوین سیر و مغازی، ص ۱۹۲۔  
۵۰۔ فواد سیزگن، ص ۱۰۱۔  
۵۱۔ مبارک پوری، قاضی اطہر، ص ۱۹۲۔  
۵۲۔ ایضاً۔  
۵۳۔ فواد سیزگن، ص ۱۰۱۔  
۵۴۔ ایضاً۔  
۵۵۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔  
۵۶۔ مبارک پوری، قاضی اطہر، ص ۲۰۳ (بحوالہ تہذیب التہذیب جلد ۱۰، ص ۳۶۰)۔  
۵۷۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔  
۵۸۔ ایضاً، (بحوالہ فتح الباری جلد ۸، ص ۱۲)۔  
۵۹۔ ایضاً، ص ۷-۲۰۶۔  
۶۰۔ فواد سیزگن، ص ۱۰۳۔  
۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

## دیگر شہروں میں سیرت نگاری کا آغاز

جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو مدینہ کی اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرۃ العرب تک محدود تھا، البتہ ہمسایہ اقوام کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی اور ان کے ساتھ سرحدی چھڑپوں کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق کے عہد خلافت میں فتوحات ملکی کے عظیم سلسلہ کا آغاز ہوا اور حضرت عمر فاروق کے دور خلافت تک عراق، ایران، شام اور مصر کے وسیع علاقے فتح ہو چکے تھے۔ جو صحابہ کرام جہاد میں شریک ہوئے ان میں سے ایک بڑی تعداد انہی علاقوں میں آباد ہو گئی۔ مقیم صحابہ کی ایک بڑی تعداد، فتوحات کا عمل مکمل ہونے کے بعد ان علاقوں کی طرف کوچ کر گئی۔ حضرت عمر فاروق نے عسکری ضروریات کے پیش نظر بعض شہر آباد کرائے، جن کی ابتدائی حیثیت جُند کی تھی، یعنی وہ (Military base) کے طور پر آباد کیے گئے لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اتنے ترقی یافتہ اور خوشحال ہو گئے کہ ان کی حیثیت مستقل شہروں کی سی ہو گئی۔ حضرت عمر کے زمانے میں عراق میں دو اہم فوجی چھاونیاں بنائی گئیں ان میں ایک بصرہ ہے اور دوسرا کوفہ۔

عراق، ساسانیوں کے دور میں ایک شاندار شہر تھا جس میں ان کا پایہ تخت مدائن آباد تھا۔ عراق، دجلہ و فرات کی وادی میں جنوبی حصے کی جانب واقع ہے جس کی زمین سرسبز و زرخیز، پانی بکثرت اور فضا معتدل ہے۔ یہ علاقہ آبادی اور مدنیت میں روئے زمین پر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے

لے کر پے در پے متمدن قومیں اسی حصہ زمین پر حکمران رہیں۔ بابلی، اشوری، کلدانی، یونانی اور ایرانی قوموں نے عراق میں مختلف سلطنتیں قائم کیں۔ پرانے زمانے میں عرب بھی اس سرزمین سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ بکر اور تغلب نے جو ربیعہ کے قبائل تھے، اسی سرزمین پر قدم رکھا اور مشہور نخمی قبیلہ نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حیرہ میں منازرہ کی حکومت کہلاتی تھی۔ ۲

حضرت عمر کے عہد خلافت میں عراق کی فتح کے بعد یہاں بصرہ اور کوفہ کی فوجی چھاو نیاں بنائی گئیں جو بہت جلد دو عظیم شہروں کی شکل اختیار کر گئیں، مدائن اور بابل و حیرہ کا تمدن یہاں منتقل ہو گیا اور چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی نے جب کوفہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو ان شہروں کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔ حضرت عمر کی ہدایت پر عراق میں ۱۲ھ / ۶۳۵ء میں پہلے بصرہ کی بنیاد رکھی گئی اس کے تین سال بعد کوفہ آباد کیا گیا۔

## کوفہ:

عراق میں نیا آباد کیا جانے والا دوسرا شہر کوفہ تھا۔ جس کی بنیاد حضرت عمر کے زمانے میں انہی کے حکم پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے ۱۷ھ / ۶۳۸ء میں رکھی تھی۔ یہ شہر دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ایک وسیع میدان کے بہت بڑے رقبے پر آباد کیا گیا تھا تا کہ دار الخلافہ مدینہ تک نقل و حمل پر طبعی روکاؤٹیں اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس شہر کو بسانے کا خاص مقصد یہ تھا کہ عربوں کو ایک مضبوط اور دفاعی اعتبار سے ایک مستحکم چھاو نی حاصل ہو سکے اور نئے مفتوحہ صوبوں کے لوگوں کو آسانی سے قابو میں رکھا جاسکے۔ لفظ ”کوفہ“ کے عام معنی ہیں ”ریت کا گول ٹیلا“ اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ شہر کا قدیم ترین حصہ اسی نوع کی بلندی پر بسایا گیا ہوگا۔ کوفہ کا محل وقوع بصرہ سے زیادہ صحت افزا سمجھا جاتا تھا۔ عرب جوں جوں مشرق کی طرف بڑھتے گئے کوفہ کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا، اسی اعتبار سے یہاں کی آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ کوفہ میں

چالیس ہزار خاندانوں کی آبادکاری کی گنجائش تھی۔ ہر قبیلہ کے آباد ہونے کے لیے الگ الگ حد بندی کر دی گئی تھی۔ ابتداً کوفہ کے دو حصے کیے گئے ایک مشرقی حصہ تھا جو بہترین تھا، اور دوسرا مغربی حصہ تھا اس کے بعد قرعہ اندازی کی گئی مشرقی حصہ اہل یمن کے حصہ میں آیا، اور مغربی حصہ نزاریوں کے حصہ میں یمن کے لوگ، نزاریوں کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ چنانچہ یمنی بارہ ہزار تھے اور نزاری اٹھ ہزار۔ جو قبائل کوفہ میں آباد ہوئے ان میں بنو سلیم، بنو ثقیف، بنو ہمدان، بنو بکیلہ، بنو تیم اللات، بنو تغلب، بنو اسد، بنو کندہ، بنو ازد، بنو مزینہ، بنو تمیم، بنو عارب اور بنو مذحج وغیرہ شامل تھے۔ ۵

کوفہ حضرت عمر کے زمانے ہی میں خاصی ترقی کر گیا تھا یہاں تین سو ”اصحاب الشجرہ“ یعنی وہ اصحاب جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی اور ستر بدری صحابی آئے۔ تاہم اکثریت ”اعراب“ کی تھی جو اپنی سابقہ قبائلی اور نسلی عصبیتوں کے ساتھ آکر آباد ہوئے تھے جس کی وجہ سے کوفہ جلد ہی قریشی، غیر قریشی تصادم میں الجھ گیا۔ یہ بحران حضرت عثمان کے دور میں شروع ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ گورنر کوفہ سعید بن العاص کے خط، بنام حضرت عثمان سے ہو سکتا ہے، انہوں نے کوفہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا۔

” اہل کوفہ کے معاملات خراب ہو گئے ہیں، قدیم اور شریف

خاندان مغلوب ہو گئے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگ اور اعراب

یہاں کے معاملات پر غالب آ گئے ہیں، یہاں تک کہ شرفاء اور

بہادر اشخاص کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ۶

اہل کوفہ ابتداء سے ہی متلون المزاجی کا مظاہرہ کرتے رہے ان کی اکثریت ناقابل اعتبار تھی۔ حضرت عمر بھی ان سے شاکہ تھے۔ یہ لوگ خلیفہ کے مقرر کردہ عمال سے جلد ہی اکتا جاتے اور ان کی شکایتیں کر کر کے انہیں معزول کر دیتے۔ اس کی وجہ وہاں کی آبادی کا تنوع تھا، جتنی متنوع آبادی تھی اتنی ہی متنوع ان کی پسند اور خواہشات تھیں۔

اپنے عہد خلافت کے آخری چھ سالوں میں حضرت عمر کو تین بار کوفہ کا عامل بدلنا پڑا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سخت برہم ہو کر کہا ”خدا کی پناہ کوفہ کے لوگ بھی عجیب و غریب ہیں، اگر میں ان پر کوئی مضبوط آدمی حاکم بناتا ہوں تو یہ اس میں کیڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں، اور اگر کسی کمزور کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر و تذلیل شروع کر دیتے ہیں۔“ ۸؍ یوں تو ابتداء سے ہی کوفہ اور اہل کوفہ کا ایک سیاسی کردار نظر آتا ہے، تاہم جب حضرت علی نے خلیفہ بننے کے بعد کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو اس شہر کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

کوفہ نے علمی پہلو سے بھی بہت جلد اور بہت زیادہ ترقی کی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ عراق کے قدیم آباد کار مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے اور علم و فن کے حوالے سے بہتر ماضی کے حامل تھے مثلاً عراق میں سریانی آباد تھے جن کے مدارس بھی تھے جہاں وہ یونانی علوم و آداب کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، اسی طرح سے کچھ نصرانی فرقے بھی موجود تھے، حیرہ میں یونانی بھی موجود تھے جو اپنی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے۔ یہ یونانی، ان گرفتاران جنگ میں سے تھے جو ایران و یونان کے مابین ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں گرفتار ہو کر آئے تھے۔ ان میں سے اکثر اہل عراق نے فتح کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا جس کے نتیجے میں ان افکار و آراء نے اسلامی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا ۹۔ اور وہ جو پہلے سے علمی سرگرمیوں میں مصروف تھے، اسلام لانے کے بعد، علمی سرگرمی میں اضافے کا باعث بنے۔

عراق کی علمی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ ایک زرخیز ملک تھا، جہاں فارغ البالی اور عیش و آرام کے اسباب مہیا تھے لہذا وہاں کے باشندوں کو اتنا وقت مل سکتا تھا کہ وہ علمی مشاغل کی طرف توجہ دے سکیں۔ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا اور عربوں نے وہاں کی زرخیزی، شادابی اور دولت کا حال سنا تو عراق کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ عراق کی آب و ہوا، ثروت اور زرخیزی کی وجہ سے عرب کے

لوگ یہاں سکونت پسند کرنے لگے تھے۔

جس طرح سے عہد صدیقی، فاروقی و عثمانی میں مدینہ تمام تر سیاسی و دینی معاملات کا گڑھ تھا۔ یہ دارالخلافہ تھا، یہیں سے فوجیں روانہ ہوتی تھیں اور یہیں واپس آتی تھیں، یہاں ایسے صحابہ کرام کی کثرت تھی جو رسول اللہ کے احوال و تعلیمات کے امین تھے لہذا فطری طور پر مدینہ میں سیر و مغازی اور حدیث و تفسیر کا چلن زیادہ رہا۔ اسی طرح کوفہ کے سیاسی حالات نے اسے مذاہب دینیہ کا گڑھ بنا دیا۔ لہذا یہاں عقائد اور کلام کے مباحث نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔

علوی دور میں اور اس کے بعد عہد بنو امیہ میں عراق سب سے زیادہ جنگوں، فتنوں اور بغاوتوں کا میدان بنا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر بصرہ کی جانب گئے اور حضرت علی کوفہ کی طرف۔ بصرہ اور کوفہ کے درمیان جنگ جمل ہوئی، جس میں دونوں اطراف سے ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے۔ یہیں سے فوجیں تیار ہو کر، جنگ صفین کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہیں خارجی فتنے کا آغاز ہوا، کوفہ کے نزدیک ہی نہروان میں حضرت علی اور خارجیوں کے مابین فیصلہ کن معرکہ ہوا، جس میں ہزاروں خارجی ہلاک ہوئے۔ پھر کوفہ ہی میں ایک خارجی کے ہاتھوں حضرت علی کی شہادت کا واقعہ رونما ہوا۔ کوفہ میں حضرت حسن نے خلافت سے دست برداری کے معاہدہ پر دستخط کیے۔ کوفہ کے نزدیک ہی حضرت حسین واقعہ کربلا میں شہید ہوئے، مختار ثقفی نے کوفہ ہی میں امام حسین کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بغاوت کی اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ مصعب ابن زبیر اور مختار ثقفی کی آخری فیصلہ کن جنگ کوفہ میں ہوئی جس میں مختار ثقفی کا خاتمہ ہوا۔ بعد میں عبدالملک بن مروان کی افواج نے مصعب بن زبیر سے جنگ کی اور آخر الذکر کا خاتمہ ہوا۔ الغرض ۳۷ھ/۶۵۸ء سے ۷۱ھ/۶۹۱ء تک کے تینتیس سالہ دور میں خصوصاً کوفہ شورشوں، ہنگاموں، فتنوں اور بغاوتوں کی آماجگاہ بنا رہا جس کا فطری نتیجہ



یہ تھا کہ لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات اُبھرتے تھے کہ ان میں سے کون سا فریق برسرِ حق ہے اور کون سا برسرِ باطل؟ حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر کو حضرت علی سے جنگ کرنے کا حق تھا یا نہیں؟ تحکیم کے معاملہ میں حضرت علی نے درست قدم اٹھایا تھا یا نہیں؟ خوارج کا اُبھرنا اور پھر ان کا اپنے موقف پر ڈٹ جانا، مسلمانوں میں فرقہ بندی کا آغاز تھا تو کیوں؟ یہ تمام سوالات لوگوں کے ذہنوں میں اٹھتے تھے، پھر یہ سوالات مساجد اور مدارس میں زیرِ بحث آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عراق خصوصاً کوفہ ہی زیادہ تر مذاہبِ دینیہ کا گڑھ بن گیا۔ علماء کی توجہ انہی مباحث میں الجھی رہی۔ لہذا ان کی تمام تر توجہ فقہ اور عقائد کے مسائل پر مرکوز رہی۔ سیرت اور مغازی کی طرف توجہ کم رہی۔ اس حوالے سے دورِ اول میں ہمیں کوفہ میں صرف دو ہی اہم سیرت نگار نظر آتے ہیں اور وہ ہیں امامِ شعیبی اور السبعی۔

### عامر بن شراحیل شعیبی: (م ۱۰۳ھ / ۷۲۱ء)

ابو عمرو عامر بن شراحیل بن عبد الشعیبی۔ ان کا تعلق قبیلہ حمیر سے تھا اور ان کا شمار بنو ہمدان میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ شعب نامی ایک پہاڑ، جو یمن میں تھا، سے منسوب ہیں۔ اس قبیلہ کے جو لوگ کوفہ میں آباد ہوئے انہیں ”شعیبیون“ کہا گیا اور ان میں سے جو لوگ مصر اور مغرب میں جا کر بس گئے ان کا نام ”اشعیبیون“ پڑ گیا اور جو لوگ شام میں بس گئے انہیں ”شعیبیون“ کہا گیا اور جو لوگ یمن ہی میں رہے وہ ”آل ذی شعیبین“ کہلائے۔ شعیبی کی والدہ جنگِ جلولاء کی اسیرانِ جنگ میں سے تھیں، امامِ شعیبی کا کہنا ہے کہ وہ جنگِ جلولاء کے سال پیدا ہوئے، یعنی ۱۹ھ میں۔ ۱۲

انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور بہت سے اکابر صحابہ اور صحابیات سے روایت کی ہے۔ امامِ شعیبی کا بیان ہے کہ میں نے پانچ سو صحابہ

کا زمانہ پایا ہے۔ ۱۳۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا، اپنے زمانے میں دینی علوم کا مرجع تھے۔ اموی خلفاء و امراء سے اچھے تعلقات تھے، تقریباً دس سال تک عجم کی فتوحات میں شریک رہے۔ عبدالملک بن مروان نے ان کو شاہ روم کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ابتداء میں حجاج بن یوسف سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ ایک بار حجاج نے ان سے چند سوالات پوچھے اور جوابات کو تسلی بخش پا کر نہ صرف شععی کو ان کی قوم کا نمبردار اور تمام ہمدان قبیلہ کا سربراہ بنا دیا بلکہ بیت المال سے ان کی تنخواہ بھی مقرر کر دی ۱۴۔ حجاج بن یوسف نے بامیان (افغانستان) کے راجہ ربیل کے پاس سفارت میں بھی بھیجا مگر ۸۱ھ میں حجاج بن یوسف کے مظالم کے خلاف ابن اشعث کی زیر قیادت ہونے والی بغاوت میں شریک ہو گئے۔ ابن اشعث کے ساتھ کئی قراء اور علماء شامل ہو گئے تھے تاہم ۸۳ھ میں جب دیر جمجم کے فیصلہ کن معرکہ میں ابن اشعث کو شکست ہو گئی تو یہ دوسرے شرکاء کی طرح نو ماہ تک اپنے مکان میں روپوش رہے۔ بعد میں یزید بن ابی مسلم نے بیچ میں پڑ کر شععی کی جان بخشی کرائی ۱۵۔ اسی روپوشی کے زمانے میں انہوں نے غزوات و فتوحات پر ”کتاب الفتح“ لکھی تھی۔

اس سے قبل ۶۶ھ میں مختار بن عبید ثقفی نے کوفہ پر غلبہ حاصل کر کے بہت سے لوگوں کو قتل کیا تو امام شععی آٹھ ماہ تک مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے یہاں مقیم رہے۔ ۱۶۔ اس عرصہ میں انہوں نے حدیث کا علم بھی حاصل کیا اور مسجد نبوی میں مغازی و سیر کا درس بھی دیتے تھے۔ ایک بار جبکہ حضرت ابن عمر بھی وہاں موجود تھے انہوں نے کہا یہ اس طرح مغازی بیان کر رہے ہیں جیسے مجاہدین کے ساتھ موجود تھے۔ ۱۷۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کے اسی طرح کے اعترافی کلمات تاریخ بغداد از خطیب بغدادی اور تہذیب التہذیب از ابن حجر عسقلانی میں بھی مذکور ہیں، اس سے امام شععی کی فن مغازی میں مہارت اور وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ سیرت و مغازی پر ان کی

”کتاب الفتح“ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قیام مدینہ منورہ کے دوران، جبکہ وہ مغازی پر درس دیتے تھے، اس کی تدوین بھی کی ہو۔ تاہم یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ”کتاب الفتح“ کب لکھی گئی۔ ۱۸

الشعبی کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ کتاب المغازی

۲۔ الفرائض والجراحات

۳۔ الکفایہ فی العبادۃ والطاعة

۴۔ کتاب الفتوح۔ ۱۹

### عمر و بن عبد اللہ السبعی: (م ۱۲۷ھ / ۷۴۴ء)

ابو اسحاق عمرو بن عبد اللہ السبعی ہمدانی ۳۲ھ / ۶۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ انکا تعلق قبیلہ ہمدان کی شاخ ”سبیج“ سے تھا۔ ۲۰ یہ عمر بھر کوفہ میں رہے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۳۸ صحابیوں سے حدیث کا سماع کیا تھا، علم حدیث میں کمال حاصل تھا۔ بہت عابد و زاہد تھے ۲۱۔ مغازی کے بہت بڑے عالم تھے تاریخ طبری میں بعض قطععات سے پتہ چلتا ہے کہ طبری نے السبعی کی کتب مغازی اور فتوحات سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور واقدی نے بھی ان کی بہت سی عبارتیں دی ہیں ۲۲۔ ۱۲۷ھ میں پچاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۲۳

### بصرہ:

۱۲ھ / ۶۳۵ء میں حضرت عمرؓ کی ہدایت پر عراق میں بصرہ کی پہلی فوجی چھاوونی قائم کی گئی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا، آباد کاری کے حوالے سے بصرہ کو کوفہ پر تقدم حاصل ہے۔ بصرہ کے لفظی معنی ”سیاہ سنگریزے“ کے ہیں چونکہ اس علاقے میں سیاہ سنگریزے

بکثرت تھے اس لیے اس جگہ کا نام بصرہ پڑ گیا، صحابی رسول حضرت عتبہ بن غزوہ بن یاسر پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضرت عمرؓ کی ہدایت پر ۱۲ھ میں بصرہ شہر آباد کیا ۲۴ھ اس شہر کو آباد کرنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ عراق، خلیج فارس اور ایران کے راستوں کی نگرانی کی جاسکے نیز آئندہ فرات اور دجلہ کے مشرق کی طرف شروع ہونے والی مہات کے لیے یہ شہر نقطہ آغاز بن سکے ۲۵ھ، نیز اس چھاوٹی کو آباد کرنے کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ عرب صحرا کی آب و ہوا سے متمتع ہوتے رہیں۔

بصرہ کی آب و ہوا، کوفہ کے مقابلے میں زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن بعض سیاسی اور معاشی فوائد ایسے تھے کہ یہاں کے آباد کار یہیں جمے رہے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط تک یعنی ۱۵۵ھ تک یہ فوجی چھاوٹی ترقی کر کے ایک مکمل قصبہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بصرہ کے ابتدائی آباد کار عرب فوجی تھے جنہوں نے جنگ نہاوند (۲۱ھ / ۶۴۲ء) نیز اصطر، فارس، خراسان، جستان کی تسخیر (۲۹ھ / ۶۵۰ء) میں حصہ لیا جس سے ایک طرف تو مال غنیمت کی صورت میں شہر بصرہ میں خوشحالی آئی، دوسری طرف غلاموں اور موالی کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا، گو کہ یہ اضافہ کوفہ کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

سب سے پہلے بصرہ میں وہ دو ہزار سپاہی آباد ہوئے جو جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ پھر حضرت عتبہ بن غزوہ کے ساتھ پانچ ہزار افراد مزید آئے اس کے بعد یہ تعداد مسلسل بڑھتی رہی۔ جلد ہی بصرہ پانچ قبائلی حلقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۱۔ اہل العالیہ: یعنی حجاز کے بالائی علاقوں کے باشندے۔

۲۔ بنو تمیم: مضری قبائل میں انہیں اولین درجہ حاصل ہے۔

۳۔ بنو بکر بن وائل: یکے از قبائل ربیعہ

۴۔ بنو عبد القیس: یکے از قبائل ربیعہ

۵۔ بنو ازد: یعنی قبیلہ (ازد سراقہ و ازد عمان)

ان میں بنو ازدیمینی تھے باقی سب عدنانی قبائل تھے۔ بصرہ کے فوجیوں کا طبقہ انہی عرب عناصر سے مرکب تھا۔ ان کے علاوہ عراق کے اصل باشندے اور باہر سے آئے ہوئے گروہ مثلاً ایرانی، ہندی، سندھی، اور زنجی وغیرہ شامل تھے۔ ۳۶ھ

سیاسی طور پر بصرہ بھی کوفہ کی طرح ہنگاموں اور فتنوں کی اماں جگہ تھا۔ اسی قصبے میں جنگ جمل پیش آئی (۳۶ھ / ۶۵۶ء) جس میں مسلمان پہلی بار اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ہزاروں لوگ قتل ہو گئے۔ اگلے سال اہل البصرہ نے جنگ صفین میں حضرت علی کی حمایت کی، خارجیوں کو بھی بصرہ سے اپنے لیے کافی حامی دستیاب ہو گئے۔ پہلی خانہ جنگی کے خاتمے پر ۴۱ھ / ۶۶۲ء میں جب امیر معاویہ کی خلافت قائم ہوئی تو انہوں نے بصرہ میں ازسرنو اموی اقتدار قائم کیا۔ زیاد بن ابی سفیان کے دور گورنری میں بصرہ اور کوفہ نے بہت ترقی کی۔ تاہم اموی دور میں بصرہ میں سیاسی اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ اور ہمیشہ ہی بصرہ پر امن نہیں رہا۔

جہاں تک یہاں کی علمی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو بصرہ ہی وہ مقام ہے جہاں عربی صرف و نحو نے جنم لیا، یہیں علم الکلام اور فلسفہ کی گرما گرمی رہی، 'معتزلہ' یہیں پروان چڑھے، حسن بصری اور ان کے عقیدت مندوں نے تصوف کی بنیاد بھی یہیں رکھی، شعر و شاعری کے میدان میں عہد بنو امیہ کے بڑے بڑے شعراء بشار بن برد اور ابونواس ایسے مجدد پسند شعراء اسی سرزمین سے اٹھے۔ فلاسفہ کی ایک جماعت "اخوان الصفا" بھی بصرہ میں پیدا ہوئی۔ تاہم یہ امر تعجب خیز ہے کہ یہاں دور اول میں سوائے ابوالمعتز سلیمان بن طرخان کے کوئی بڑا سیرت نگار نظر نہیں آتا۔

کوفہ کی طرح بصرہ میں بھی بے شمار صحابہ کرام آکر آباد ہوئے جن میں سے زیادہ علمی شہرت حضرت ابو موسیٰ اشعریٰ اور انس بن مالکؓ کی ہے۔ ابو موسیٰ یمن کے رہنے والے تھے۔ مکہ میں آکر مسلمان ہوئے اور حبشہ کی طرف دوسرے مہاجرین کے

ساتھ ہجرت کی۔ ان کا شمار صحابہ کے اندر بڑے علماء میں ہوتا ہے، آپ بصرہ تشریف لائے اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ قرآن و حدیث کی معرفت کے علاوہ فقیہ بھی تھے۔

انس بن مالک کا تعلق انصار مدینہ سے تھا، جب رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انس نو عمر بچے تھے، تقریباً دس سال تک وہ رسول اللہ کی خدمت کرتے رہے آپ کی وفات کے بعد بصرہ میں سکونت اختیار کر لی اور لمبی عمر پائی۔ بصرہ میں صحابہ کے اندر سب سے آخر میں وفات پانے والے آپ ہی تھے۔ ان کا انتقال ۹۲ھ میں ہوا، حضرت انس فقیہ ہونے کی نسبت محدث زیادہ تھے۔

### ابو المعتمر سلیمان بن طرخان تیمی: (م ۱۴۳ھ / ۷۶۰ء)

انہی انس بن مالک کے شاگرد ابو المعتمر سلیمان بن طرخان تیمی تھے۔ یہ بنو ضبیعہ کی شاخ عمرو بن مرہ بن عباد کے مولیٰ تھے، انہیں بنی تیم کی جانب اس لیے منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی رہائش گاہ اور مسجد انہی لوگوں کی بستی میں تھی۔ فضل بن عیسیٰ رقاشی قاضی کی دختر ان کے عقد میں تھیں، انہی کے بطن سے معتمر بن سلیمان پیدا ہوئے ۲۷ھ نہایت عبادت گزار تھے۔ انس بن مالک کے علاوہ بہت سے قدیم تابعین اور حضرت حسن بصری وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، ان کی دقیقہ رسی کی وجہ سے اہل علم ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں انہوں نے بصرہ میں ۱۴۳ھ میں انتقال کیا۔ ۲۸

ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد سے سہو ہوا ہے۔ انہوں نے بیٹے کا تذکرہ، والد کی جگہ کر دیا۔ نیز انہیں ”تمیمی“ بتایا ہے جبکہ وہ ”تیمی“ مشہور تھے۔ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں، دراصل ان کے بیٹے معتمر کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں ہیں ۲۹ مزید تصدیق کے لیے رجوع کیجئے ابن قتیبہ کی المعارف، ص ۲۰۹ (قدیمی کتب خانہ، کراچی)، ابن سعد کی طبقات (مترجم راغب رحمانی، نفیس اکیڈمی، کراچی جلد

۷، ص ۲۷۱) نیز فواد سیزگین کا مقالہ 'سیرت نگاران نبوی' (مترجم شیخ نذیر حسین) مشمولہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۹۳ء۔

ان کی ایک کتاب المغازی کا پتہ چلتا ہے جس کی روایت کی اجازت خطیب بغدادی نے حاصل کی اور دمشق میں اس کی روایت کی ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں اس کے دو بڑے اقتباسات لیے ہیں نیز امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں خصوصاً جلد پنجم میں ابوالمعتز سلیمان بن طرخان کی چند روایتیں نقل کی ہیں۔

## یمن:

یمن عرب کا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب، آباد اور متمدن علاقہ ہے، یہ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی علم کا مرکز رہا ہے۔ یہاں عمارات اور قلعوں کے آثار بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں جو قدیم اور شاندار تمدن کا پتہ دیتے ہیں۔ قرب و جوار کی سلطنتوں نے مثلاً روم، فارس اور حبشہ نے اس پر متواتر حملے کیے اور بعض اوقات فتح بھی کیا۔ اس کی قدیم تاریخ کے حوالے سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کی رو سے اس سرزمین کے مختلف اقطاع میں وقتاً فوقتاً عمالیق، اہل معین، عاد، سبا اور حمیر کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں ہیں جنہوں نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں جن کی عظمت کے آثار اب تک باقی ہیں۔ ترقی زراعت کے لیے وادیوں میں بڑے بڑے بند بنائے گئے جن میں سب سے زیادہ مشہور سد مأرب ہے، جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہوا ہے۔ ہندوستان، فارس، حبش، مصر اور عراق کی تجارتیں ان ہی کی وساطت سے قائم تھیں۔ یہاں کے پہاڑ معدنیات و جواہر سے معمور تھے۔ آخر زمانے میں تقریباً ستر سال کے لیے اہل حبشہ یمن پر قابض ہو گئے تھے، جن کو آخر کار اہل فارس نے نکال دیا اور خود قبضہ کر لیا۔ ظہور اسلام کے وقت یمن حکومت فارس کے ماتحت تھا۔ حکومت فارس کی طرف سے باذان یہاں کا گورنر تھا، جو ۷ھ یا ۹ھ میں مسلمان ہو گیا۔ بقیہ اہل یمن جو زیادہ تر

مذہباً یہودی تھے ۱۰ھ میں داعی اسلام حضرت علی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ہمدان یمن کا ایک مشہور قبیلہ تھا، یہ پورا قبیلہ صرف ایک دن میں مشرف بہ اسلام ہوا ۳۲۱ پورا ملک یمن بغیر کسی جنگ و جدل کے اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا۔

یمن میں علمی سرگرمیاں اسلام سے قبل بھی جاری تھیں جس زمانے میں مدرستہ المغازی مدینہ میں سیر و مغازی پر ابتدائی کتابیں مدون ہو رہی تھیں اسی زمانے میں یمن کے شہر صنعاء میں اس فن کی ابتدائی کتابیں لکھی گئی، جس کے مولف وہب بن منبہ صنعانی ہیں۔

### وہب بن منبہ صنعانی (م ۱۱۰ھ / ۷۲۹ء)

ابو عبداللہ وہب بن منبہ فارسی النسل تھے ۳۴ھ میں پیدا ہوئے ۳۳۔ یہ ان ایرانیوں کی نسل میں سے تھے جنہیں ایرانی بادشاہ کسریٰ نے اہل حبشہ کے تسلط کے خلاف فوج کشی کی غرض سے یمن بھیجا تھا ۳۴۔ پھر یہ لوگ یہیں آباد ہو گئے، یہیں شادیاں کیں، ان کی اولاد ”انباء“ کہلاتی تھی ۳۵۔ وہب نے حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے۔ صنعاء کے قاضی تھے، نہایت عابد، زاہد اور بزرگ انسان تھے ان کے بڑے بھائی ہمام بن منبہ (م ۱۰۱ یا ۱۰۲ھ) حضرت ابو ہریرہ کے خاص شاگرد تھے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت کردہ حدیث کا ایک مجموعہ ”صحیفہ ہمام بن منبہ“ مرتب کیا تھا ۳۶۔ ۱۰۰ھ کے لگ بھگ وہ مکہ آئے تھے یہاں انہوں نے متعدد ممتاز علماء اور فقہاء سے ملاقاتیں کیں، عمر کے بالکل آخری حصہ میں وہ قید کر دیئے گئے تھے۔ بظاہر یہ قیدیمن کے گورنر یوسف عمر ثقفی کے حکم سے تھی جو ۱۰۶ھ تا ۱۲۰ھ تک یمن کا والی رہا تھا کسی نامعلوم سبب سے اس نے ۱۱۰ھ میں وہب کے کوڑے لگوائے، یہاں تک کہ وہ انتقال کر گئے۔ ۳۷



وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کی کتابوں میں سے ۷۲ کتابیں پڑھی تھیں۔ امم سابقہ کے اخبار و احوال کے زبردست عالم تھے۔ کثرت معلومات میں کعب الاحبار کے ہم پلہ مانے جاتے تھے۔ کعب الاحبار مشہور نو مسلم یہودی عالم تھے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کو مسجد دمشق کی تعمیر کے وقت (۸۷ھ) پتھر کا ایک ٹکڑا ملا جس پر کسی اجنبی زبان میں کچھ کندہ تھا وہ پڑھوانے کے لیے وہب کے پاس بھیجا گیا تھا۔ وہب تاریخ کے بڑے عالم تھے، انہیں دنیا کے قیام، انبیاء کے احوال اور بادشاہوں کے حالات کی بہت معلومات حاصل تھیں۔ ان کی ایک تصنیف حمیر کے بادشاہوں کی سوانح اور ان کے قصص و واقعات اور قبور و اشعار پر مشتمل ہے جس کا نام ”الملوک المتوجه من حمیر و اخبارهم و قصصهم و قبورهم و اشعارهم“ ہے اسے ایام العرب کے طریقے پر مدون کیا گیا ہے اس میں وہب بن منبہ نے طریق اسناد کی پابندی نہیں کی ہے۔ قدر کے بارے میں بھی ایک کتاب ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے، جس کے لیے عمرو بن دینار کا قول ہے کہ انہوں نے شہر صنعاء میں وہب بن منبہ کے گھر پر دیکھی تھی۔ ۳۸

اسی طرح ایک ”کتاب المبتداء“ یا المبداء بھی وہب کی طرف منسوب کی جاتی ہے یہ اہل کتاب کی روایات پر مبنی نہ صرف نوع انسانی کے آغاز کی تاریخ ہے، بلکہ قصص الانبیاء یعنی قدیم رسالت کی بھی تاریخ ہے۔ جو زف ہو روٹس ان کی کتابوں کے حوالے سے کہتے ہیں ”اگر ہم مغازی کے مفہوم کو وسیع تر معنوں میں سمجھ لیں جس کی ضرورت بھی ہے اور جیسا کہ یہ اسلام کے قرون اولیٰ میں سمجھا بھی گیا ہے اور پھر رسول اللہ کی پوری حیات مبارکہ پر اس کا اطلاق کریں تو وہب کی یہ سب کتابیں ہماری بحث کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ یہ سیرت کا دیباچہ ہیں اور آنحضرت سے قبل رسالت کی تاریخ بتاتی ہیں۔“ ۳۹ وہب سے ایک ترجمہ (زبور داود) بھی منسوب کیا جاتا ہے جس کا نام ”کتاب

زبور داودہ ترجمہ وہب ابن منبہ) بتایا جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی معروف ترجمہ ہے جسے ”کتاب المز امیر ترجمہ الزبور“ کہا جاتا ہے اور اس کے نسخے آج تک پائے جاتے ہیں۔ وہب کی طرف کچھ مواعظ بھی منسوب کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے صحف سماوی اور حکمت لقمانی کے مطالعے سے اخذ کیے تھے۔ ۴۰

حاجی خلیفہ نے وہب کی ایک کتاب المغازی کی اطلاع دی ہے۔ ۴۱۔ جس کا نام ”مغازی رسول اللہ“ بیان کیا گیا ہے لیکن اب اس کے کچھ آثار نہیں ملتے۔ اور ابتدائی کتب سیرت میں اس کے حوالے مفقود ہیں تاہم سی۔ ایچ۔ بیکر (C.H BECKER) نے ہائڈل برگ (جرمنی) میں وہب کی اس کتاب کے ایک جزو کو دریافت کیا ہے۔ یہ وہب کی وفات سے ایک سو اٹھارہ سال بعد (۲۲۸ھ) میں لکھا گیا اس میں بیعت عقبہ کبریٰ، دارالندوہ میں قریش کی میٹنگ، رسول اللہ کی ہجرت، مدینہ میں آپ کی آمد اور غزوہ بنو خثیمہ کے واقعات درج ہیں ۴۲۔

الغرض باب چہارم کے بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دور اول، یعنی پہلی صدی ہجری کے نصف آخر سے دوسری صدی ہجری کے وسط تک کا سو سالہ دور سیرت نگاری کے حوالے سے انتہائی نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس عرصہ میں سب سے زیادہ مستند اور کثرت سے، سیرت و مغازی کے حوالے سے کام سامنے آیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف سیرت و مغازی ہی نہیں بلکہ حدیث، تفسیر اور دیگر علوم دینیہ کی کثرت میں کوئی شہر مدینہ کا نہ ہمسر تھا اور نہ مد مقابل۔ یہاں تک کہ مولد رسول اللہ، مکہ معظمہ بھی کبھی مدینہ کی ہمسری نہ کر سکا، اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ کی ہجرت کے بعد تقریباً تمام مسلمان مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ ہجرت کے بعد بھی اہل مکہ میں سے جو اسلام لائے وہ مدینہ چلے جاتے، جبکہ مدینہ کو چھوڑ کر مکہ جانے والا کوئی نہیں تھا بلکہ یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی تھی، ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں بیان کیا ہے کہ محمد بن عمر نے بیان کیا کہ ہمیں

ان مہاجرین میں سے جو جنگ بدر میں شریک تھے کوئی صحابی معلوم نہیں جو رسول اللہ کی وفات کے بعد مکہ واپس جا کر وہاں آباد ہو گیا ہو، سوائے اُبی سبرہ کے، جو رسول اللہ کی وفات کے بعد مکہ لوٹ گئے اور وہیں رہنے لگے، لیکن مسلمانوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا، خود اُبی سبرہ کی اولاد اس واقعہ کا انکار کرتی تھی۔ اور سختی سے اس کی تردید کرتی تھی اُبی سبرہ کی اولاد کے آگے اس واقعہ کا ذکر بھی کر دیا جائے تو ان لوگوں کو اس پر غصہ آجاتا تھا۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اکابر قریش کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ بلا ضرورت شدیدہ مدینہ سے باہر نہ جائیں۔ اس طرح مدینہ ان صحابہ کرام کا مرکز بن گیا تھا جو حاملین علم تھے جس کی وجہ سے علمی نقطہ نظر سے مدینہ کا مرتبہ، صرف مکہ سے ہی نہیں بلکہ دیگر شہروں سے بھی بڑھ گیا۔ اور مملکت اسلامیہ کا کوئی بھی شہر کم از کم ایک، ڈیڑھ صدی تک مدینہ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکا۔

دور اول میں مدینہ کے علاوہ صرف تین شہر اور تھے جہاں سیرت و مغازی پر ابتدائی کتب تصنیف کی گئیں، ان میں کوفہ، بصرہ اور یمن شامل ہیں۔ کوفہ میں عامر بن شراحیل شععی نے دیگر کتب دینی و تاریخی کے علاوہ ایک 'کتاب المغازی' تصنیف کی تھی، دوسرے عمر بن عبد اللہ السبعی تھے، جن کی کتاب المغازی کا سراغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کوفہ میں دور اول میں سیرت پر کوئی کام نہیں ہوا ہاں البتہ یہاں تاریخ، خصوصاً مقامی تاریخ، علم الانساب اور عقائد دینیہ پر زیادہ زور رہا اور اس حوالے سے کئی کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً زیاد بن ابی سفیان (م ۵۳ھ) نے "انساب العرب" پر ایک کتاب لکھی۔ تاکہ عرب جو اس کے نسب پر طعن کرتے تھے ان کو جواب دیا جاسکے۔

محمد بن سائب کلبی (م ۱۴۶ھ / ۷۶۳ء) نے بھی "کتاب الانساب" میں عربوں کے نسبی حالات جمع کیے۔ ۴۳ اسی طرح مقامی تاریخ لکھنے کے حوالے سے عوانہ بن حکم کلبی ۴۴ کا نام سامنے آتا ہے جو کوفہ کے علماء میں سے تھے۔ عوانہ (م ۱۴۷ھ /

۶۳ء) نے ”کتاب التاریخ“ تالیف کی۔ انہوں نے ”کتاب السیرة معاویہ بنو امیہ“ بھی لکھی جو امیر معاویہ کی سیرت کا احاطہ کرتی ہے۔ کوفہ کی اصل علمی شہرت فقہی مسائل اور علوم دینیہ کے حوالے سے ہے۔

کوفہ کے بعد اگر بصرہ کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی دور اول میں صرف ایک کے علاوہ کوئی سیرت نگار نظر نہیں آتا اور وہ ابوالمعتز سلیمان بن طرخان تیمی (م ۱۳۳ھ ۶۰ء) ہیں جن کی کتاب المغازی کا پتہ چلتا ہے جس کی خطیب بغدادی نے دمشق میں روایت کی۔ ویسے بصرہ بڑا علمی مرکز بنا تاہم یہاں سارا زور علم الکلام، فلسفہ اور تصوف پر رہا، نیز علم نحو نے بھی یہیں جنم لیا اور یہیں فروغ پایا۔

تیسرا شہر جہاں سیرت نگاری کی کم از کم ایک کتاب کا پتہ چلتا ہے وہ یمن ہے، یمینوں کے پاس بہر حال تاریخ نگاری کا ایک شعور اور چلن، اسلام سے قبل بھی نظر آتا ہے۔ حضرت امیر معاویہ جنہیں تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، انہوں نے یمن ہی کے ایک عالم عبید بن شریہ جرہمی ۴۵ھ کو دمشق بلایا تھا، جہاں عبید نے تاریخ پر ایک کتاب ”کتاب الملوک و اخبار الماضین“ لکھی تھی، یہ کتاب ملک یمن کے حالات پر مبنی تھی۔ سیرت و مغازی پر یمن میں صرف وہب بن منبہ کا نام نظر آتا ہے۔ دمشق (شام) میں دور اول میں سیرت پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فن مغازی اور سیرة پر خاص توجہ دی تھی اور انہوں نے دیگر شہروں میں مغازی کا حلقہ درس قائم کرنے کا حکم بھی دیا تھا اور حضرت عاصم بن عمر بن قتادہ (م ۱۲۱ء) جو اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ انہیں جامع دمشق میں مغازی کے درس پر مامور کیا تھا لیکن شام میں دور اول میں سیرت کی کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔

دور اول میں، مدینہ سے باہر لکھی جانے والی سیرت کی ان ابتدائی کتابوں کا اسلوب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولفین نے سیرت یا مغازی سے متعلق حدیثوں کو ایک جگہ جمع

کر دیا۔ اس میں ترتیب و تزئین، ادبی چاشنی، اور دقیق علییت کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔  
مولف اسباب و علل میں بھی نہیں الجھتا تھا۔ سیرت کی یہ ابتدائی کتابیں، حدیث کے طرز پر  
مع سند کے لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابتدائی تین سو سالوں تک جاری رہا۔

## حواشی و حوالہ جات (باب چہارم)

- ۱۔ مصری، احمد امین 'فجر اسلام'، ص ۱۷۹ (لجنتہ التالیف والترجمہ وانشر، قاہرہ، ۱۹۶۵ء)۔
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔
- ۳۔ الدینوری، ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۴۶ (قدیمی کتب خانہ، کراچی)۔
- ۴۔ یاقوت حموی 'معجم البلدان' جلد ۴، ص ۴۹۱ (دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۷۹ء)۔
- ۵۔ شہر کوفہ میں قبائل کی آباد کاری کی تفصیل بلاذری کی فتوح البلدان (ذکر تمصیر الکوفہ) اور طبری کی تاریخ الامم والملوک جلد ۴، ص ۴۰ تا ۴۸، نیز یاقوت حموی کی معجم البلدان جلد ۴، ص ۴۹۰ تا ۴۹۳ میں دیکھی جاسکتی ہے۔
- ۶۔ طبری، ابن جریر تاریخ الرسل والملوک (یعنی تاریخ طبری) جلد ۴، ص ۲۷۸ (دارالمعارف) مصر ۱۹۶۱ء)۔
- ۷۔ ظہیر، نگار سجاد 'عرب اور موالی'، ص ۱۴۷ (قرطاس، کراچی ۲۰۰۶ء)۔
- ۸۔ البلاذری 'فتوح البلدان'، ص ۲۷۸، نیز ابن اثیر 'الکامل فی تاریخ' جلد ۳، ص ۳۲۔
- ۹۔ فجر اسلام، ص ۱۸۲۔
- ۱۰۔ المعارف ص ۱۹۹۔
- ۱۱۔ یہ جنگ سیدنا عمر فاروق کے عہد خلافت میں ۱۹ھ میں لڑی گئی، جلولاہ فارس کی بستی کا نام ہے۔
- ۱۲۔ المعارف، ۱۹۹۔
- ۱۳۔ ان کی بزرگی، شرف اور علمی مرتبہ کا احوال جاننے کے لیے دیکھئے ابو ذہبی کی 'تذکرۃ الحفاظ' جلد ۱، ص ۸۳۔
- ۱۴۔ 'تذکرۃ الحفاظ' جلد ۱، ص ۸۶۔

۱۵۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۸۷۔

۱۶۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی ایک بیوی صفیہ، مختار ثقفی کی بہن تھیں۔ یہ شادی ۱۶ھ میں ہوئی تھی اس کے علاوہ مختار ثقفی کو کئی واسطوں سے حضرت عمر سے قرابت تھی مثلاً حضرت عمر کی ایک نواسی ام سلمیٰ بنت عبید اللہ بن عمر بن خطاب کی شادی مختار کے بیٹے ابو امیہ سے ہوئی اور یوں حضرت عمر کی نواسی، مختار کی بہن تھیں (دیکھئے ابن حزم اندلسی کی جمہرۃ انساب العرب، ص ۲۶۸)۔ اسی طرح حضرت عمر کے ایک پوتے عبداللہ بن عبداللہ بن عمر، مختار کے داماد تھے ان کی بیوی کا نام ام سلمہ بنت مختار ثقفی تھا (دیکھئے جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۵۳)

۱۷۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۳۵۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ فواد سیزگین، ص ۸۹۔

۲۰۔ المعارف، ص ۱۹۹۔

۲۱۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے 'تذکرۃ الحفاظ' جلد ۱، ص ۸-۱۰۶۔

۲۲۔ فواد سیزگین، ص ۹۸۔

۲۳۔ المعارف، ص ۱۹۹۔

۲۴۔ ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۲۶، طبری، ابن جریر 'تاریخ الرسل والملوک' جلد ۲، ص

۵۹۰۔

۲۵۔ اردو دائرہ المعارف الاسلامیہ جلد۔۔۔، ص ۵۷۸۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ ابن قتیبہ الدینوری 'المعارف'، ص ۲۰۹۔

۲۸۔ فواد سیزگین، ص ۱۰۲۔

۲۹۔ دیکھئے ڈاکٹر انور محمود خالد کی کتاب ”اردو نثر میں سیرت رسول“، ص ۱۱۷۔

۳۰۔ فواد سیزگین، ص ۱۰۲۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن، جلد ۱، ص ۱۰۱-۲۔

۳۳۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۹۸۔

۳۴۔ ابن قتیبہ ’المعارف‘، ص ۲۰۲۔

۳۵۔ ابن خلکان ’وفیات الاعیان‘، جلد ۶، ص ۴۱۔

۳۶۔ وہب کے کئی بھائی تھے جن میں ہمام بن منبہ ان سے بڑے تھے۔ دوسرے بھائیوں میں معقل بن منبہ اور عمر بن منبہ تھے وہب نے ان دونوں سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں (ابن قتیبہ، المعارف، ص ۲۰۲)۔

۳۷۔ جوزف ہورووٹس، ص ۷۳۶۔

۳۸۔ وفیات الاعیان جلد ۶، ص ۴۰۔

۳۹۔ جوزف ہورووٹس، ص ۷۳۸۔

۴۰۔ جوادی علی، ’تاریخ طبری کے ماخذ‘، ص ۵۹، مترجم نثار احمد فاروقی۔

۴۱۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۷۷ (بحوالہ کشف الظنون، از حاجی خلیفہ)۔

۴۲۔ انور محمود خالد، ص ۹۸۔

۴۳۔ ابو نصر محمد بن سائب کلبی کوفہ کے ان علماء میں سے تھے جو تفسیر، تاریخ اور انساب

سے دلچسپی رکھتے تھے۔ خصوصاً علم انساب میں انہیں فوقیت حاصل تھی۔ کوفہ میں ان کا

انتقال ہوا۔ کتاب الانساب کے علاوہ ان کی ایک کتاب ”تقسیم القرآن“ بھی تھی (ابن

الندیم، الفہرست، ص ۱۲۴، دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء)۔

۴۴۔ ابن الندیم ’الفہرست‘، ص ۱۲۰۔



۴۵۔ عبید بن شریہ جرہمی حضرت امیر معاویہ کے عہد خلافت میں گذرا ہے۔ اس نے رسول اللہ کا زمانہ بھی پایا لیکن آپ سے کچھ سماع نہیں کیا۔ امیر معاویہ نے اس کو صنعاء (یمن) سے بلوایا تھا۔ وہ حضرت امیر معاویہ کے پاس آیا تو انہوں نے اس سے گذشتہ اقوام اور ملوک عرب و عجم کے اخبار و احوال، اختلاف السنہ کے وجوہ، اور لوگوں کے مختلف شہروں میں بکھر جانے کے علل و اسباب دریافت کیے۔ اس نے امیر معاویہ کے ہر سوال کا جواب دیا۔ امیر معاویہ نے حکم دیا کہ یہ چیزیں ضبط تحریر میں لائی جائیں اور انہیں عبید بن شریہ جرہمی کی طرف منسوب کیا جائے۔ عبید بن شریہ، عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت تک زندہ رہا۔ اس کی تصنیفات میں ”کتاب الامثال“ اور ”کتاب الملوک و اخبار الماضین“ شامل ہیں (ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۱۸)۔

## سیرت نگاری کا ارتقاء (دور ثانی)

سیرت نگاری کا دور ثانی، جو دور عروج بھی ہے، دوسری صدی ہجری کے وسط سے تیسری صدی ہجری کے اختتام تک ہے۔ اس دور میں سیرت نگاری کا تیزی سے ارتقاء ہوا یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر تک یہ فن اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ دوسرے دور کا آغاز ۱۵۰ء کے لگ بھگ کرنے کی بنیادی وجہ امام المغازی محمد ابن اسحاق ہیں۔ جن سے سیرت کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جاسکتا ہے اور اس دور کا خاتمہ ۳۰۰ھ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ اور حدیث کے راے جدا ہو گئے اور سیرت کا علم جو تاریخ ہی کا ایک شعبہ ہے اپنے عروج کو پہنچ گیا، سیرت کی ابتدائی اور اہم ترین کتابیں اس دور میں تصنیف ہو چکی تھیں۔ جو بعد میں متقدمین کی کتب کہلائیں اور متاخرین سیرت نگاروں میں کوئی ان کتب سے بے نیاز نہیں رہ سکا۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ تیسری صدی ہجری انویں صدی عیسوی اسلامی علوم و فنون کے عروج کا زمانہ ہے اور اس صدی کے خاتمے تک علمائے اسلام نے جس موضوع پر جو کچھ لکھ دیا۔ وہی بعد کے علماء و مصنفین کا سرمایہ علم و فن ٹھہرا۔ یہ ضرور ہوا کہ بعد میں ان میں تہذیب و تنقیح اور تحقیق کے نئے نئے زاویے پیدا ہوئے، اجمال کی تشریح کی گئی یا تفصیل کی تلخیص، مگر اس کا محور تیسری صدی تک کی تصانیف ہی تھیں یہی حال سیر و مغازی کا ہے کہ اس زمانے تک یہ فن تصنیفی لحاظ سے مکمل ہو گیا تھا۔ اس دور تک

کتب سیر و مغازی کا ماخذ و منبع پہلی و دوسری صدی کی کتابیں تھیں، اس کے بعد علماء نے اپنے ذوق و وجدان اور احوال و ظروف کے مطابق اس فن میں کتابیں لکھیں جن میں بہت سی روایات قابل نقد و نظر شامل ہو گئیں۔

۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں بنو امیہ کے زوال کے بعد بنو عباس برسرِ اقتدار آئے، یہ محض ایک خانوادہ حکومت کی تبدیلی نہ تھی، اسی طرح یہ دمشق سے بغداد کی سیادت کی منتقلی ہی نہ تھی اور نہ صرف عربوں کے بجائے عجمیوں کی بالادستی ہی کی مظہر تھی بلکہ اسرہ حاکمہ کی یہ تبدیلی ایک نئے دور کا آغاز اور ایک نئی فکری و علمی سرگرمیوں کی ابتداء تھی، عہد خلافت راشدہ و بنو امیہ میں عربوں کی عسکری قوت نے اہل عجم کو زیر کیا تھا اب جو دور آیا اس میں مفتوحین (خصوصاً ایرانیوں) کی تہذیب و ثقافت نے فاتحین یعنی عربوں کو مفتوح کیا۔

### نیا دارالخلافہ بغداد:

بنو عباس جب برسرِ اقتدار آئے تو ان کے پہلے خلیفہ ابو العباس السفاح نے انبار کو اپنا دارالحکومت بنایا، لیکن المنصور کوفے کے قریب ہاشمیہ منتقل ہوا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ مقام اس کے لیے موزوں نہیں لہذا بڑی دیکھ بھال اور چھان بین کے بعد اس نے بالآخر فوجی، غذائی اور آب و ہوا کے لحاظ سے بغداد کا مقام پسند کیا۔ جہاں ایک مدور شہر کی تعمیر کی گئی۔ بغداد دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ یہ خراسان کی سڑک پر ایسی جگہ آباد تھا جہاں کاروانوں کے مختلف راستے آکر ملتے تھے اور مہینے کے مہینے میلے لگتے تھے چنانچہ عوام اور فوج کے لیے یہاں سامان رسد افراط سے مل سکتا تھا، اس کے اردگرد نہروں کا ایک جال تھا جو زراعت کے لیے بھی نہایت کارآمد تھیں اور شہری دفاع کا بھی کام دے سکتی تھیں۔ یہ مقام عراق کے وسط میں واقع تھا، آب و ہوا معتدل اور صحت افزا تھی۔

منصور کے عہد خلافت میں بغداد کی تعمیر شروع بھی ہوئی اور مکمل بھی ہوئی، دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے بڑی برق رفتاری سے یہاں آباد کاری بھی شروع ہوئی، تجارتی، اور معاشی سرگرمیاں جاری ہوئیں، سیاسی اور فوجی سرگرمیاں کا گڑھ تو تھا ہی، جلد ہی تمدنی اور علمی طور پر بھی نمایاں ہونے لگا۔

عباسی عہد میں بغداد علم و ثقافت کا عظیم مرکز بن گیا تھا یہیں بیت الحکمہ قائم ہوا جس میں دوسری زبانوں کے علمی کتابوں کے ترجمے بھی ہوتے تھے۔ علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم طبعی نے بھی ارتقا کی منازل طے کیں بغداد کی مسجدیں، خصوصاً جامع المنصور، علوم کے بڑے مرکز تھے، کتابوں کی دوکانوں کی بھی کثرت تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تہذیب و ثقافت کی گہما گہمی تھی۔ بغداد میں شعراء، ادباء اور فضلاء کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ سب کا احاطہ مشکل ہے۔ خطیب بغدادی کی ”تاریخ بغداد“ کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علم کے ایک ایک شعبہ میں بغداد سے تعلق رکھنے والے فضلاء کی تعداد کتنی تھی۔ صرف خلفاء ہی نہیں بلکہ وزراء اور امراء سب ہی علم و فضل کی قدر افزائی کرتے تھے۔ ۴

امویوں کے دارالخلافہ دمشق سے، عباسیوں کے دارالخلافہ بغداد کی معاشرتی زندگی بالکل مختلف تھی۔ بغداد عراق کے جس حصہ میں واقع تھا وہ ایرانیوں کے پایہ تخت مدائن سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ لہذا بغداد پر ایرانی روایات اور ایرانی معاشرتی زندگی کی گہری چھاپ تھی۔ اپنی اصل میں یہ معاشرہ ایرانی تکلفات کا پیکر اور بازنطینی تعیشتات کا مظہر تھا۔ عربوں کی سادگی اور امویوں کی بدویت سے اسے کوئی علاقہ نہیں تھا۔

عہد عباسیہ ذہنی اور فکری سرگرمیوں کے لیے بھی دوسرے ادوار سے مختلف ہے۔ اس عہد میں اسلامی علوم کی تدوین اور ضابطہ بندی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ احادیث نبویہ کی روایت، تحریر و تسوید کا سلسلہ عہد بنو امیہ میں شروع ہو چکا تھا، جیسا کہ پچھلے ابواب میں بیان

کیا گیا، لیکن ان احادیث کی درجہ بندی، اور مضامین کے اعتبار سے ان کی فنی تقسیم عباسی دور میں کی گئی، اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی حالات غزوات اور فتوحات اسلامی سے تعلق رکھنے والی احادیث کو دور اول میں یعنی بنی امیہ کے عہد میں مدون تو کیا گیا، لیکن اسے ایک مستقل فن کی حیثیت اس دور ثانی میں حاصل ہوئی جو عباسی دور کی ابتدائی ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔

دور ثانی یعنی دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر تیسری صدی ہجری کے اختتام تک، سیرت نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے، جو صرف بغداد میں ہی نہیں بلکہ مدینہ، کوفہ، شام، الجزائرہ، واسط، رے، خراسان، مصر و اندلس غرض پوری مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس دور تک آتے آتے علمی اسفار کی روایت بھی مستحکم ہو چکی تھی۔ ایک عالم، حصول علم کے لیے اپنے وطن سے نکل کر شہروں شہروں پھرتا تھا اور بعض اوقات کسی دوسرے شہر میں انتقال کرتا تھا۔ لہذا جیسا کہ ہم نے پچھلے ابواب میں اہتمام کیا تھا کہ ایک علاقہ کے سیرت نگاروں کا تذکرہ یکجا کر دیا تھا، وہ اب ممکن نہیں ہوگا کیونکہ ایک عالم پیدا بصرہ میں ہوتا ہے تصنیف و تالیف کا کام بغداد یا مصر میں کرتا ہے، اور انتقال مدینہ میں ہوتا ہے، ایسے میں اسے کسی ایک شہر سے وابستہ کر دینا قرین انصاف نہیں ہوگا۔ اور بعض اوقات اس بات کا تعین بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنا تصنیفی کام کہاں کیا؟

دوسری دشواری یہ ہے کہ دور ثانی میں سیرت نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے، جن میں سے ہر ایک کے تفصیلی تذکرہ سے معاملہ بہت پھیل جائے گا۔ لہذا پہلے اس دور کے تین نمائندہ سیرت نگاروں کا تذکرہ کیا جائے گا یعنی امام المغازی محمد ابن اسحاق، محمد بن عمر الواقدی اور محمد ابن سعد کاتب الواقدی۔ پھر اگلے باب میں اس دور کے دیگر سیرت نگاروں کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے گا تاکہ سیرت نگاری کے حوالے سے دور ثانی کا ایک مربوط نقشہ سامنے آسکے۔

## دور ثانی کے تین نمائندہ سیرت نگار

### محمد ابن اسحاق۔ محمد بن عمر الواقدی۔ محمد ابن سعد

دور ثانی میں سیرت نگاری کے حوالے سے تین ”محمد“ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ انتخاب آسان نہیں تھا، کیونکہ دور ثانی میں ہزاروں نہ سہی سینکڑوں سیرت نگار مملکت کے کونے کونے میں سیرت و مغازی کے حوالے سے تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، کتابیں روایت کی جا رہی تھیں، شیوخ کی کتابوں میں اضافے اور ترمیم کر کے سابقہ کتاب کا تازہ ورژن تیار کیا جا رہا تھا، سیر و مغازی کی روایات کی تنقیح و تشریح ہو رہی تھی، ایسے میں سینکڑوں سیرت نگاروں میں سے چند کا انتخاب کاردار ہے۔

یہ انتخاب دو حوالوں سے کیا گیا ہے

اولاً۔ وہ سیرت نگار ایسا ہو جس نے فن سیرت نگاری میں ایک رجحان متعین کیا ہو بالفاظ دیگر وہ ”رجحان ساز“ (Trend-Setter) ہو۔ جس کی متاخرین نے تقلید کی ہو۔  
ثانیاً۔ اس کا کام اصل (Original) ہو جو متاخرین کے لیے بنیاد ہو۔ ایسا بنیادی ماخذ جس سے صرف نظر ممکن نہ ہو۔

دور ثانی کے تین ”محمد“ اس کسوٹی پر پورا اترتے ہیں

### محمد ابن اسحاق: (م ۱۵۱ھ / ۷۶۸ء)

حالات زندگی:

ابو بکر محمد بن اسحاق بن یسار بن خیار بن کوتانان مطلبی، فارسی الاصل اور قیس

بن مخرمہ بن عبدالمطلب کے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے دادا یسار ابن خیار ۱۲ھ میں عین التمر کی جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ آئے تھے۔ ان کے والد اسحاق ابن یسار اور دونوں چچا عبدالرحمن ابن یسار اور موسیٰ بن یسار مدینہ کے مشہور محدثین اور فقہا میں سے تھے۔ اسحاق بن یسار نے صبیح مولیٰ حویطب بن عبدالعزیٰ کی بیٹی سے نکاح کیا جن سے ۸۵ھ / ۷۰۴ء میں محمد پیدا ہوئے۔ ابن اسحاق کے دو بھائی ابوبکر اور عمر تھے، محمد ابن اسحاق سب سے بڑے تھے۔ ابن اسحاق خاصے خو برو تھے۔ ۸۱ البتہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ان کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بھینگے تھے۔ ابن اسحاق کے حوالے سے ابن الندیم نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ امیر مدینہ کو اطلاع پہنچی کہ محمد خو برو عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ امیر نے اسے بلایا اور حکم دیا کہ اس کے سر کے بال کم کر دیئے جائیں (اس کے سر کے بال بہت خوبصورت تھے) اس کے کوڑے لگائے گئے اور مسجد کے آخری حصہ میں بیٹھنے سے روک دیا گیا۔ ۹۔ (کیونکہ مسجد کے آخری حصہ میں خواتین بیٹھا کرتی تھیں)

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ”محاکمہ“ میں اسے ہتک آمیز روایت کہہ کر رد کیا ہے،

وہ کہتے ہیں ”شاید یہ بے جا بات ہے یا اس کا سبب معاصرین کی منافرت ہے۔ ۱۰۔  
ڈاکٹر حمید اللہ اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بیان میں امیر مدینہ کا نام ہشام ہے، جبکہ ہشام ۸۲ھ سے ۸۶ھ تک مدینہ کا والی رہا، حالانکہ ابن اسحاق ۸۵ھ میں پیدا ہوئے اس لیے یہ قصہ صحیح نہیں ہے لہذا یہ کہ ہشام سے مراد اسماعیل بن ہشام ہو جو ۱۰۲ھ سے ۱۰۴ھ میں مدینہ منورہ کا والی رہا۔ ۱۱۔

محمد ابن اسحاق تقریباً تیس سال تک مدینہ ہی میں رہے اور یہیں کے علماء سے علم حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے انس بن مالک، سعید بن مسیب کو دیکھا اور قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق، ابان بن عثمان بن عفان، محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی

طالب، ابو سلمہ بن عبدالرحمن بن عوف، عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج، نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری وغیرہ سے علم حاصل کیا ۱۲۔ اس کے علاوہ انہوں نے عاصم بن قتادہ اور عبداللہ بن ابی بکر سے بھی تعلیم حاصل کی۔ یزید بن رومان (تلمیذ عروہ بن زبیر) کے حلقہ درس میں بھی رہے۔ تفسیر کا درس محمد بن ابی احمد اور مغیرہ بن لبید سے لیا۔ اسرائیلیات کے بارے میں معلومات وہب بن منبہ سے حاصل کیں۔ سیرت ابن ہشام میں غیر معروف اساتذہ کو چھوڑ کر ابن اسحاق کے ایک سوشیوخ کا ذکر موجود ہے۔ ۱۳۔ مدینہ میں ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ ان پر قدری ہونے کا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا، اس وقت وہ مسجد میں موجود تھے جب والی مدینہ کے اہلکار انہیں لے گئے ۱۴۔ ان کی گردن میں رسی ڈال کر انہیں گرفتار کیا۔ ان پر قدری ہونے کا الزام تھا درآں حالیکہ قدری عقیدہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خطیب بغدادی بھی ان کے قدری ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ان کو شیعہ بھی کہا ہے۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں ”بہت سے علماء نے منجملہ دیگر اسباب کے ابن اسحاق کی روایات سے استدلال کرنے سے اس لیے گریز کیا کہ وہ شیعہ تھے ۱۵۔ یاقوت نے کہا ”یحییٰ بن سعید بن قطان سے روایت ہے کہ محمد ابن اسحاق، حسن بن ضمیر، اور ابراہیم بن محمد یہ سب اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے تھے اور حضرت علی کو حضرت عثمان پر ترجیح دیتے تھے۔ ۱۶۔ ہر حال ان الزامات کے باوجود ابن اسحاق سے امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔

مدینہ میں ابن اسحاق کو دو بزرگوں کی مخالفت برداشت کرنا پڑی۔ ان میں سے ایک امام مالک تھے اور دوسرے ہشام بن عروہ۔ جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے ابن اسحاق نے ایک دفعہ ان کی تذلیل کی اور پھر اسے دہراتے رہے۔ وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ میں لوگوں کے انساب اور ان کی لڑائیوں کے متعلق ابن اسحاق سے زیادہ جاننے



والا اور کوئی نہ تھا۔ ابن اسحاق کا گمان تھا کہ امام مالک ذی الصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں اور امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں ان دونوں کا ایک دفعہ مناظرہ بھی ہوا۔ جب امام مالک نے موطاء تصنیف کی تو ابن اسحاق نے کہا ”یہ کتاب میرے پاس لاو اس کا ناقد تو میں ہوں“ یہ بات امام مالک تک پہنچی تو انہوں نے کہا ”یہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہودیوں کی روایات نقل کرتا ہے۔“ اے اتاہم جب ابن اسحاق عراق جانے لگے تو دونوں میں مصالحت ہو گئی تھی۔ اور امام مالک نے ابن اسحاق کو کچھ تحائف بھی دیئے تھے۔

جہاں تک ہشام بن عروہ سے ابن اسحاق کے اختلافات کا تعلق ہے اس کا سبب یہ تھا کہ محمد ابن اسحاق ایک حدیث فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے تھے، فاطمہ بنت منذر ہشام بن عروہ کی زوجہ تھیں۔ جب اس روایت کا ہشام کو علم ہوا تو بہ سبب غیرت انہوں نے انکار کیا اور کہا، کیا وہ میری بیوی سے ملا ہے۔ ۱۸

ہوسکتا ہے اسی مخالفانہ فضا کی وجہ سے محمد ابن اسحاق نے مدینہ کو خیر آباد کہا ہو۔ مدینہ سے آپ ۱۱۵ھ میں اسکندریہ آئے۔ ۱۹ اہل مصر کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ان میں یزید بن ابی حبیب اور قیس بن ابی زید بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ جب ان کے حاسدوں نے ان پر قدری ہونے کا الزام لگایا اور مدینہ کے والی نے انہیں گرفتار کیا اور کوڑے لگائے تو انہوں نے اس وقت مدینہ کو خیر باد کہا۔ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ شہرت کے حامل ہوں گے اسی وجہ سے علمائے مصر نے ان کا استقبال کیا۔ ۲۰

جب ابن اسحاق مدینہ سے مصر پہنچے تو یہ اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کا زمانہ (۱۰۵ھ/۷۲۲ء تا ۱۲۵ھ/۷۴۳ء) تھا، اور مملکت میں وہ افتراق و انتشار شروع ہو چکا تھا، اور وہ عباسی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی جس نے بالآخر بنو امیہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور

عباسیوں کو مسندِ خلافت پر براجمان کر دیا۔ پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح کا پانچ سالہ دور اقتدار (۱۳۲ھ / ۷۵۰ء تا ۱۳۶ھ / ۷۵۴ء) بھی ہنگاموں اور انتقامی کارروائیوں میں گذرا تا آنکہ دوسرا عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور ۱۳۶ھ میں خلیفہ بنا۔ یہ بیس سال کا عرصہ ابن اسحاق نے مصر، کوفہ، جزیرہ اور رے میں گزارا۔ اور ۱۳۶ھ میں وہ ابو جعفر المنصور کے پاس گئے۔ اور انہوں نے اپنی ”کتاب المبتداء والمبعث والمغازی“ ابو جعفر المنصور کی فرمائش پر لکھی۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ابن اسحاق نے یہ کتاب بغداد میں لکھی جیسا کہ قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی کتاب ’مدوین سیر و مغازی‘ (ص ۲۱۰) پر لکھا ہے کیونکہ اس وقت بغداد کا شہر تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اور منصور غالباً حیرہ میں تھا جیسا کہ ابن قتیبہ نے تصریح کی ہے۔ ۲۱۔ جب منصور نے ۱۳۶ھ میں بغداد کی بنیاد رکھی تو ابن اسحاق نے بھی یہاں سکونت اختیار کی اور وہیں دفن ہوئے۔ وہ بغداد کے ابتدائی ساکنان میں سے ہیں۔

ابن اسحاق کی کتاب المغازی کا سنہ تالیف ۱۳۶ھ ہی بتایا جاتا ہے۔ جب ابن اسحاق عباسی خلیفہ سے ملنے گئے تو ابو جعفر المنصور کا بیٹا مہدی ۲۲ وہیں بیٹھا تھا ابو جعفر المنصور نے ابن اسحاق سے کہا کہ آپ میرے اس بیٹے کے لیے ایک کتاب لکھ دیں جس میں تخلیق آدم سے لے کر آج تک کے حالات ہوں، چنانچہ ابن اسحاق نے کتاب لکھی۔ ابو جعفر نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ بہت تفصیلی ہے۔ اس کو مختصر کریں، ابن اسحاق نے اس کی تلخیص لکھی، پہلی ضخیم کتاب کو شاہی کتب خانہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ ۲۳۔

تاہم ابن خطیب ہی کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق نے خلیفہ منصور سے ملاقات سے پہلے مدینہ ہی میں اس کتاب کو مکمل کر لیا تھا اور اس کا ایک نسخہ سلمہ بن الفضل ۲۴ کے حوالے کیا تھا۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ انتہائی ضخیم کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں لکھ لینا، اور پھر اس کی تلخیص جو خود بہت ضخیم ہو،

کر لینا ممکن نہیں۔

اسی خیال کا اظہار جوزف ہورووٹس اپنے مقالہ میں کرتے ہیں کہ ابن اسحاق نے یہ کتاب مدینہ ہی میں مکمل کر لی تھی، اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کے راویوں میں سے ایک بھی راوی عراقی نہیں ہے سارے راوی مدنی ہیں۔ اسی حوالے سے وہ کہتے ہیں ”اس کے علاوہ ہمیں ایک مدنی کا حال بھی معلوم ہے جس نے ابن اسحاق کی کتاب سے روایت کی ہے یعنی ابراہیم بن سعد (م ۱۸۴ھ)“ ۲۵ گویا جوزف ہورووٹس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابن اسحاق نے اپنی کتاب مدینہ میں مکمل کر لی تھی، اور وہاں کم از کم ابراہیم بن سعد اس کتاب کی روایت بھی کرتے تھے۔

ابن اسحاق کا انتقال بغداد ہی میں ہوا۔ ان کے سنہ وفات میں اختلاف ہے جو ۱۵۰ھ سے ۱۵۴ھ کے درمیان بتایا جاتا ہے تاہم زیادہ درست ۱۵۱ھ ہے ۲۶ وہ خیزران کے قبرستان میں دفن کیے گئے، یہ قبرستان خیزران کی طرف اس لیے منسوب ہے کہ خیزران، جو کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ تھی، وہاں مدفون ہے۔ یہ قبرستان دجلہ کے مشرقی جانب واقع تمام قبرستانوں میں سب سے مقدم ہے۔

## ابن اسحاق کے بارے میں علماء کی رائے:

ابن اسحاق جلیل القدر، ثقہ، محدث، فقہ اور مغازی کے امام ہیں سیر و مغازی کے حوالے سے یہ حیرت منانے والے ہیں البتہ ان کی حدیث کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ کچھ علماء ان کی حدیث کو لیتے ہیں اور کچھ محدثین حلال و حرام میں ان کی حدیث قبول نہیں کرتے۔

علی بن عبداللہ مدینی نے کہا ہے کہ اہل مدینہ کی حدیثوں کا دار و مدار محمد بن شہاب زہری کے بعد مالک بن انس اور محمد ابن اسحاق پر ہے۔ ان کے شیخ ابن شہاب زہری جو خود بہت پائیہ کے عالم، محدث اور فقیہ تھے ابن اسحاق کے بہت قدر دان تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ جب تک ابن اسحاق مدینہ میں ہیں مگر کثیر باقی ہے۔ نیز وہ کہتے تھے جو شخص مغازی کا علم حاصل کرنا چاہتا ہو وہ قیس بن مخرمہ کے اس غلام سے حاصل کرے۔ ایک بار زہری سے ابن اسحاق کی مغازی کے بارے میں سوال کیا گیا تو زہری نے شہادت دی کہ ”یہ مغازی کے سب سے بڑے عالم ہیں“ اور علمی طور پر اس کی شہادت یوں دی کہ ابن اسحاق نے مغازی کی جو روایات عاصم بن عمر بن قتادہ سے بیان کی ہیں ان کو بڑی انشراح سے لیا کرتے تھے۔ ۲۷

ابن اسحاق کے ایک اور شیخ (استاد) عاصم بن عمر بن قتادہ کا قول ہے کہ جب تک ابن اسحاق زندہ رہیں گے لوگوں میں علم باقی رہے گا۔

شعبہ بن حجاج نے ان کو حفظ و اتقان میں امیر المومنین بتایا ہے بلکہ ان کے ایک قول کے مطابق ابن اسحاق امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ ۲۸

امام شافعی کا یہ قول ملتا ہے کہ ”جو مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ابن اسحاق کا محتاج ہے“۔ ۲۹

امام احمد بن حنبل، تفسیر، ملاحم، اور مغازی کو بے اصل کہنے کے باوجود ابن اسحاق کے بارے میں کہتے ہیں کہ مغازی وغیرہ کی روایت ان سے کی جائے گی البتہ حلال و حرام میں احتیاط کی جائے گی۔ ۳۰ امام احمد بن حنبل کا ایک اور قول ہے کہ ”ان کی حدیث حسن ہوتی ہے“۔ ۳۱

امام مالک سے تو ان کی معاصرانہ چشمک تھی تاہم امام مالک کے سب سے زیادہ متبع، اسماعیل بن ابی اویس تھے، ان کے والد کے پاس ابن اسحاق کی کتاب المغازی تھی اور انہوں نے اس سے بہت زیادہ روایتیں منتخب کیں۔ ۳۲

ابوزرعہ دمشقی کا بیان ہے کہ اکابر اہل علم ابن اسحاق سے روایت کرنے پر متفق ہیں، محدثین نے ان کو آزمایا تو ان میں صدق اور خیر پایا۔ ۳۳

ذہبی کہتے ہیں ”یہ علم کا خزانہ اور مغازی اور سیر کے علم میں حبر امت ہیں۔ یہ حدیث کے زیادہ ضبط کرنے والے نہیں تھے اس لیے ان کی حدیث صحت کے درجہ سے گر گئی ہے ورنہ فی نفسہ یہ صدوق اور پسندیدہ ہیں“۔ ۳۳

یحییٰ بن معین کا کہنا ہے ”یہ ثقہ ہیں لیکن قابل صحت نہیں ہیں“ ۳۵۔ امام علی مدینی فرماتے ہیں ”ان کی حدیث میرے نزدیک صحیح ہے“ ۳۶ انہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ کی حدیث کا مدار چھ باتوں پر ہے جن کا انہوں نے ذکر کیا، پھر کہا کہ ان چھ باتوں کا علم بارہ علماء کے پاس ہے جن میں انہوں نے محمد ابن اسحاق کا نام بھی لیا۔ ۳۷

امام نسائی فرماتے ہیں ”یہ قوی نہیں ہیں“ دارقطنی کہتے ہیں ”ان سے صحت نہیں پکڑی جاتی“۔ ۳۸

ابن عیینہ فرماتے ہیں میں نے کسی کو ابن اسحاق پر تہمت لگاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ ۳۹

امام بخاری نے تاریخ کبیر جلد اول باب الحمدین میں لکھا ہے ”مجھے ایسا شخص نہیں ملا جس نے ابن اسحاق پر اتہام لگایا ہو۔“ ۴۰

امام مسلم نے مباہیات کے ضمن میں ان سے روایات لی ہیں اور امام بخاری نے بھی ان سے کچھ نہ کچھ استشہاد کیا ہے۔ ابو داؤد، ترمذی نسائی اور ابن ماجہ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض محدثین کی اس احتیاط کے باوجود جو وہ ابن اسحاق کی حدیث کے بارے میں روارکتے تھے، وہ مغازی و سیر میں مقبول ہوئے اور مستند مانے گئے۔ ان کی کتاب المبتداء و المغازی و المبعث کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی کسی دوسرے عالم کی کتاب المغازی اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔

اس کتاب نے عوام و خواص کو قصہ کہانی اور نجوم و فلسفہ کی کتابوں سے ہٹا کر

ان میں رسول اللہ ﷺ کے سیر و مغازی کا شوق پیدا کر دیا۔ علی بن محمد خراسانی کا بیان ہے کہ خلیفہ قاہر باللہ نے مجھ سے بنو عباس کے خلفاء کے اخلاق و عادات کے بارے میں سوال کیا، میں نے بتایا کہ ابو جعفر المنصور نے سب سے پہلے نجومیوں کو دربار میں جگہ دی، سریانی اور عجمی زبانوں کے تراجم کرائے، کلیلہ و دمنہ، اقلیدس، اور دیگر یونانی کتب سے عوام کو دلچسپی ہو گئی۔ ابن اسحاق نے یہ صورت دیکھ کر سیر و مغازی کو جمع کیا ہے۔ ۴۱

ابن عدی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کے فضل و کمال کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے امراء و ملوک کو لایعنی کتابوں کی مشغولیت سے ہٹا کر رسول اللہ کے مغازی، آپ کی بعثت اور ابتدائے خلق کے واقعات پڑھنے میں لگا دیا۔ یہ فضل و کمال سب سے پہلے ان کو حاصل ہوا ان کے بعد ایک جماعت نے مغازی پر کتابیں لکھیں مگر ان میں سے کوئی ابن اسحاق کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا۔ ۴۲

## ابن اسحاق کی سیرت نگاری:

سیرت رسول اللہ پر ابن اسحاق کی کتاب کا نام کتاب المبتداء و المبعث و المغازی ہے۔ فنی اعتبار سے سیرت پر یہ بنیادی اور رجحان ساز کتاب ہے۔ اس کے تین اجزاء ہیں۔

۱۔ المبتداء

۲۔ المبعث

۳۔ المغازی

سیرت نگاری میں اس قسم کی تقسیم کی مثال محمد ابن اسحاق سے قبل نہیں ملتی، البتہ ان کے شاگردوں اور بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے ضرور اس کی تقلید کی، اور سیرت نگاری برسہا برس تک اسی نہج پر ہوتی رہی۔

المبتداء: یہ دراصل ماقبل اسلام کی تاریخ ہے، جو مزید چار حصوں میں تقسیم ہے۔ اس میں

پہلا حصہ ابتدائے آفرینش سے حضرت موسیٰ تک وحی و رسالت کی تاریخ ہے۔ اس حصہ کو مرتب کرتے ہوئے ابن اسحاق نے وہب بن منبہ اور ابن عباس کی روایات پر اعتماد کیا ہے، اسرائیلیات، کتاب مقدس یعنی توراہ کے اقتباسات اور قرآنی آیات کو بھی بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ المبتداء کی دوسری فصل عہد جاہلیت میں یمن کی تاریخ ہے۔ آخر یمن ہی کی تاریخ کیوں؟ اس کا جواب جوزف ہورودتس دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ”قرآن کے مطالعہ کی وجہ سے یمن کی تاریخ سے علماء کی دلچسپی پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی۔ قرآن کریم، سورہ ۸۵ میں ”اصحاب الاخدود“ کا بیان ہے اس سے ہمارے علماء اس طرف متوجہ ہوئے کہ یمن میں عیسائیت اور یہودیت کے فروغ کا زمانہ تحقیق کریں، کیونکہ تفاسیر ماثورہ کہتی ہیں کہ ان آیات میں یہودی بادشاہ ذونواس کے سقوط کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ”اصحاب الفیل“ (سورہ ۱۰۵) کا مطالعہ کرتے ہوئے یمن کے ایک حبشی گورنر ابرہہ کی فوج کی تفصیلات درکار تھیں“۔ ۳۳

المبتداء کا تیسرا جزو عرب قبائل اور ان کی اصنام پرستی سے بحث کرتا ہے اور چوتھے جزو میں رسول اللہ کے قریبی اجداد، اور اہل مکہ کے سوم و عقائد کو بیان کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ’المبتداء‘ کے حصے میں اسناد نہیں ہیں البتہ اس کی پہلی فصل میں کہیں کہیں اسناد موجود ہیں۔

المبعث: اس حصہ میں رسول اللہ کی مکی زندگی، بعثت، ہجرت اور مدنی زندگی کے پہلے سال کی مہمات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس حصے میں اسانید کا اہتمام نظر آتا ہے اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا کیونکہ رسول اللہ کی زندگی کے بارے میں تفصیلات بتانے والے سینکڑوں تابعین، ابن اسحاق کے دور میں، مدینہ میں موجود تھے لہذا ابن اسحاق اپنے زیادہ تر مدنی اسانید کی روایات کے حوالے سے یہ حصہ مرتب کرتے ہیں۔

جوزف ہوروتس اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس حصہ میں وہ دستاویز بھی ملتی ہے جسے صرف ابن اسحاق نے اپنی کتاب المغازی میں شامل کیا ہے اور زمانہ مابعد کے کسی صاحب المغازی نے نہیں لیا ہے، یہ رسول اللہ کا وہ معاہدہ ہے جو آپ نے مدنی قبائل سے کیا تھا اور جسے مدینہ کا ”سماجی ضابطہ“ کہا گیا ہے ۴۴۔ گویا ابن اسحاق نے اپنی کتاب کی تدوین میں سرکاری دستاویز سے بھی مدد لی۔

اس حصے میں کئی مواقع کی فہرستیں بھی مرتب کی گئی ہیں مثلاً سابقون الاولون کی فہرست، مہاجرین حبشہ کی فہرست، انصار میں سب سے پہلے مسلمان ہونے والوں کے نام، شرکائے بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ کی فہرست، ان انصار و مہاجرین کی فہرست جنہوں نے مہاجرین کا مدینہ میں استقبال کیا۔ اور ان لوگوں کی فہرست جن کا رسول اللہ نے آپس میں مواخات کا رشتہ قائم کیا۔

فہرست سازی میں ابن اسحاق کو اولیت حاصل نہیں ہے۔ سیرت نگاری میں ”فہرست سازی“ کا سب سے پہلا کام ابن شہاب زہری کے شاگرد اور ابن اسحاق کے ہمعصر موسیٰ بن عقبہ نے کیا تھا۔ انہوں نے ”اصحاب بدر“ ۴۵ کی مکمل فہرست بنائی تھی جس کی امام مالک نے بھی تصدیق کی اور اس کو مستند قرار دیا۔

**المغازی:** یہ رسول اللہ کی مدنی زندگی کی تاریخ ہے، جس میں مشرکین عرب سے پہلی جنگ سے لے کر رسول اللہ کی وفات تک کے حالات آجاتے ہیں، اس جزو کا غالب حصہ غزوات کے بیان پر ہے۔ اس حصے میں اسناد کی باضابطہ پابندی کی گئی ہے۔ ابن اسحاق کے رواۃ اس کے مدنی شیوخ خصوصاً ابن شہاب زہری، عاصم بن عمر قتادہ، اور عبداللہ بن ابی بکر ہیں۔ ان شیوخ سے حاصل کردہ معلومات میں ابن اسحاق نمایاں اضافے بھی کرتے ہیں۔ یہ اضافے کچھ تو وہ اخبار ہیں جو انہیں دوسرے ذرائع سے حاصل ہوئے اور کچھ ان حوادث میں حصہ لینے والوں، یا ان کے رشتہ داروں کے بیانات



ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں ابن اسحاق معلومات کے حصول کے لیے کسی واقعہ سے تعلق رکھنے والوں کے پسماندگان کے پاس جا کر معلومات حاصل کرتے تھے، پھر ان معلومات کو، روایات سے موازنہ کر کے اس کی درستگی کا اندازہ لگاتے اور اپنی کتاب میں درج کرتے۔ ۴۶

غزوات کا حال لکھنے میں ابن اسحاق ایک مقررہ ضابطے کی پابندی کرتے ہیں، پہلے وہ اپنے ثقہ استادوں کے بیانات سے مرتب کی ہوئی ایک مجموعی رپورٹ (یا بیانیہ) درج کرتے ہیں پھر اس بنیادی واقعہ سے متعلق وہ انفرادی روایات بیان کر کے اس خبر کی تکمیل کر دیتے ہیں جو انہوں نے دوسرے ذرائع سے فراہم کی ہوتی ہیں۔ ۴۷

مغازی کے حصہ میں بھی کئی فہرستیں شامل ہیں۔ بدر میں لڑنے والوں، زخمی ہونے والوں، گرفتار ہونے والوں، غزوہ احد میں شہید ہونے والوں، اور غزوہ خندق، خیبر، موتہ اور طائف میں شہادت پانے والوں اور حبشہ سے واپس آنے والے مہاجرین کی فہرستیں دی ہیں۔ ۴۸

## ابن اسحاق کے ماخذ:

کتاب المغازی کا تذکرہ کرتے ہوئے، ابن اسحاق کے ماخذ کا بھی ساتھ ہی تذکرہ کر دیا گیا تھا تاہم یہاں ایک اجمالی جائزہ بے جا نہ ہوگا۔  
ما قبل اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ابن اسحاق کے ماخذ یہ تھے:

۱۔ قرآن کریم

۲۔ توراہ و اسرائیلیات

۳۔ وہب بن منبہ، ابن عباس اور دیگر نسابین کی روایات

اسلامی تاریخ بیان کرتے ہوئے ابن اسحاق کے ماخذ یہ تھے

۱۔ قرآن کریم

۲۔ شیوخ کی روایات

۳۔ سرکاری دستاویزات

۴۔ ذاتی ملاقاتوں سے حاصل کردہ معلومات

جہاں تک ابن اسحاق کے شیوخ کا تعلق ہے ان کی تعداد کم از کم بھی سو تھی، لیکن ان میں سے سب سے اہم شخصیت زہری کی ہے۔ جن کا تذکرہ اس سے قبل تفصیلی طور پر آچکا ہے۔ زہری کے علاوہ عبداللہ بن ابی بکر، اور عاصم بن عمر بھی اہم ہیں جن سے ابن اسحاق روایات اخذ کرتے ہیں۔ عروہ بن زبیر جو پہلے سیرت نگار تھے وہ بھی ابن اسحاق کا ماخذ تھے۔ ابن اسحاق نے عروہ بن زبیر کے مولیٰ یزید بن رومان ہی سے عروہ کی روایات اخذ نہیں کیں بلکہ آل زبیر کے دوسرے موالی سے بھی بہت استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ عروہ بن زبیر کے دونوں بیٹے یحییٰ بن عروہ اور ہشام بن عروہ، نیز عروہ کے بھتیجے عمر بن عبداللہ، اور محمد بن جعفر اور یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بھی ابن اسحاق کے شیوخ میں شامل ہیں۔

غیر مسلموں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ابن اسحاق کا ایک بڑا ماخذ، غیر مسلم علماء تھے چنانچہ وہ اپنے رُواۃ میں ”بعض اهل العلم من اهل الكتاب الاول“ یعنی بعض یہودی علماء کا حوالہ دیتے ہیں۔ کبھی انہیں ”اهل التوراة“ کہتے ہیں کہیں ایرانیوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عجمی علماء سے معلومات لیتے ہیں۔ بظاہر مدنی علماء میں ابن اسحاق وہ پہلا شخص ہے جس نے غیر مسلم علماء کے اقوال کو قبول کیا ہے۔ جس پر انہیں مطعون بھی کیا گیا۔ ۲۹۔

جنوبی عرب میں، ابن اسحاق سے پہلے، وہب بن منبہ نے اسی طرح کی غیر اسلامی اخبار بلا تکلف جمع کیے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ اہل کتاب کے قصوں میں ابن اسحاق نے متعدد مواقع پر وہب بن منبہ کا حوالہ دیا ہے۔ اور اسے وہب

کی روایات مغیرہ بن ابی زبید کے واسطے سے ملی ہیں۔ وہب کے بعد ابن اسحاق قدیم ترین عرب مصنف ہے جس نے توراہ اور انجیل کی عبارتیں لفظی ترجمے کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ ۵۰

ابن اسحاق کا ایک بڑا ماخذ بعض سرکاری دستاویزات بھی تھیں۔ اس حوالے سے ابن اسحاق کا سب سے بڑا ماخذ عبداللہ بن ابی بکر تھے۔ جو ابن اسحاق کے استاد تھے، جن کے خاندان میں رسول اللہ کا وہ خط محفوظ تھا جو انہیں یمن بھیجتے وقت انہیں دیا گیا تھا۔ انہیں عبداللہ نے رسول اللہ کے وثائق کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ ابن اسحاق ان دستاویزات کو عبداللہ بن ابی بکر کے حوالے سے درج کرتے تھے۔ ایک دستاویز ان کے مصری شیخ یزید بن حبیب کے حوالے سے بھی ملتی ہے۔ ۵۱

جب ابن اسحاق مصر میں تھے تو انہیں یزید بن حبیب سے ایک دستاویز ملی تھی یہ ان وفود سے متعلق تھی جو رسول اللہ نے مختلف حکمرانوں کی طرف سفارتی مشن پر بھیجے تھے۔ ابن اسحاق نے یہ دستاویز امام زہری کے پاس مدینہ بھیجی تاکہ زہری سے اس دستاویز کے مشمولات کی تصدیق کرائی جاسکے۔ ۵۲

## ابن اسحاق کا اسلوب:

ابن اسحاق کا انداز محدثانہ نہیں مگر مورخانہ تھا ان کے اس طریق کار پر انہیں کافی مطعون کیا گیا۔ محدثین نے ابن اسحاق پر سب سے بڑا الزام تدلیس کا لگایا ہے، یعنی حدیث روایت کرتے وقت اسناد میں اپنے اصلی شیخ کو بیان نہیں کرتے۔ یا جیسا کہ ابن سید الناس نے کہا کہ ابن اسحاق کبھی مکمل اسناد بیان کرتے اور کبھی متوسط راویوں کو حذف کر کے اوپر والے راوی کا ذکر کر دیتے ہیں ۵۳ امام احمد ابن حنبل کو بھی سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ ایک راوی کے بیان کو دوسرے راوی کے بیان سے علیحدہ نہیں کرتے۔ ۵۴

اصل میں اسلوب کا یہ فرق حدیث اور تاریخ کے درمیان موجود ہے۔ حدیث میں مربوط قصہ مطلوب نہیں ہوتا بلکہ بیان کردہ واقعہ کی معرفت کے بارے میں گواہی مطلوب ہوتی ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کا انحصار تو حدیث پر ہے لیکن اس کی غرض یہ ہے کہ تاریخی واقعہ سے متعلق ایک مکمل اور مربوط بیانیہ مرتب کیا جائے جسے اسانید اور روایات کے تکرار سے بوجھل نہ کیا جائے۔ یہ اسلوب جس پر ابن اسحاق پر طعنہ زنی کی گئی، امام زہری کی طرف بھی منسوب ہے اور اولین سیرت نگار عروہ بن زبیر کی طرف بھی ۵۵ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ زہری یا عروہ بن زبیر کو کسی نے مطعون نہ کیا جس طرح ابن اسحاق کو کیا گیا، میری دانست میں اس کا سبب یہ تھا کہ ابن شہاب زہری اور عروہ بن زبیر کو ایک تو زبردست خاندانی اور نسبی وجاہت حاصل تھی اور انہیں مطعون کرنا آسان نہ تھا، ابن اسحاق کی مدینہ میں کوئی نسبی اصل نہ تھی، وہ موالی میں سے تھے ان کو مطعون کرنا آسان تھا دوسری بات یہ کہ ابن شہاب زہری اور عروہ بن زبیر نے اسرائیلیات یا نصرانیات سے اپنا دامن بچا کر رکھا تھا جبکہ ابن اسحاق کی کتاب کا پہلا حصہ اسرائیلیات ہی کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ لہذا مدینہ کے علماء اور دیگر محدثین نے ان کے اس طریق کار کی مذمت کی ہے۔ اور اس پر مستر ادوہ بات جس کی طرف ڈاکٹر حمید اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ شاید ابن اسحاق کو اس منہج کی وجہ سے مطعون نہ کیا جاتا اگر امام مالک اور ابن ہشام سے ان کی منافرت نہ ہوتی۔ ۵۶

ابن اسحاق کی جمع کردہ روایات کے پائے استناد کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ وہ خود بھی اکثر مواقع پر ”فیما یزعمون واللہ اعلم“ (یعنی لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے) جسے معترضہ جملے لکھ کر اپنے شک کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن ادبی حیثیت سے اس کتاب کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ عربی نثر کی ان قدیم کتابوں میں سے ہے جو دست

برد زمانہ سے بچا کر ہم تک پہنچی ہیں۔ ۵۷۔

ابن اسحاق کی یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک مشہور و مقبول رہی اس کے نسخے ساتویں آٹھویں صدی ہجری تک عام تھے۔ علامہ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰) کے پاس یہ کتاب موجود تھی، ان کی کتاب ”اسد الغابہ“ میں کثرت سے اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں فارس کے حکمران (ابوبکر سعد زنگی) کی فرمائش پر سیرت ابن اسحاق کا فارسی ترجمہ تیار ہوا تھا۔ جس کے قلمی نسخے پیرس کے قومی کتب خانہ، الہ آباد پبلک لائبریری اور دارالعلوم دیوبند میں موجود تھے ۵۸۔ اطہر مبارک پوری کے کہنے کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ کراچی میں مشہور ماہر قانون جناب خالد اسحاق (مرحوم) کے کتب خانے میں دیکھا ہے۔

ابن اسحاق کے بعد آنے والے تقریباً تمام سیرت نگاروں نے ان کی ”کتاب المبتداء و المبعث و المغازی“ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کے مضامین کو اپنی کتابوں میں شامل کیا، اس کو منظوم کیا گیا، اس کے خلاصے اور شرحیں تیار کی گئیں غرض مملکت کے طول و عرض میں متعدد سیرت نگاروں نے اس پر کام کیا، اس کے بعد یہ کتاب منظر سے غائب ہو گئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ عبد الملک ابن ہشام بصری نے جب اس کا نیا ورژن تیار کیا تو وہ اس قدر مقبول و مشہور ہوا کہ لوگ اصل کتاب کو بھولنے لگے۔ پھر ابن ہشام کی کتاب تو روایات در روایات زندہ رہی اور چونکہ یہ ابن اسحاق ہی کی کتاب کی تلخیص و تہذیب تھی اس طرح ابن اسحاق کا نام بھی زندہ رہا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ غالباً سقوط بغداد (۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء) کے موقع پر جب بہت سے کتب خانوں کو ضائع کر کے دریا برد کر دیا گیا اور اس میں لاکھوں کتابیں ضائع ہو گئیں ابن اسحاق کی کتاب بھی شاید اسی افراتفری میں ضائع ہو گئی ہو۔ ۵۹۔

یہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ابن اسحاق کے دو شاگردوں یعنی یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ کی روایات کو اکٹھا کیا اور ترکی سے کتابی شکل میں ۱۴۰۱ھ میں شائع کرادیا۔ انہیں یہ اجزاء تلاش بسیار کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ محمد بن سلمہ کی روایت کردہ سیرۃ ابن اسحاق کے چند اجزاء ظاہر یہ دمشق کے کتب خانے میں مخطوطہ کی شکل میں موجود تھے۔ اسی طرح یونس بن بکیر کی روایت کردہ سیرۃ ابن اسحاق کے کچھ اجزاء مخطوطات کی شکل میں جامعہ قرویین کے کتب خانے سے دریافت ہوئے جن کو یکجا کر کے شائع کرنے سے ابن اسحاق کی گمشدہ سیرۃ کا ایک معتد بہ حصہ منصفہ شہود پر آگیا ہے۔

مستشرقین بھی ابن اسحاق کی کتاب کے معترف نظر آتے ہیں۔ جرمن مستشرق جوزف ہور وولس لکھتے ہیں ”ابن اسحاق کو اپنے شیوخ سے جو روایات ملیں ان میں اس نے اپنی جمع کی ہوئی بہت سی روایتیں اور اقوال شامل کر کے سیرت نبوی کو بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ یہ ترتیب و تنظیم بجائے خود ایک بڑا کام ہے چاہے ابن اسحاق سے پہلے کچھ اور لوگوں نے بھی یہ کام کیا ہو تب بھی اسے اس لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل رہے گا کہ اس نے رسول اللہ کی حیات طیبہ کے مختلف ادوار کو نہ صرف ایک تناسب کے ساتھ اپنی تالیف میں پیش کیا ہے بلکہ انبیائے سابقین کے حالات شامل کر کے سیرۃ کے موضوع میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اسے تاریخ رسالت بنا دیا“۔ ۶۰

اس کے علاوہ یوسف ہارویز، الفریڈ گیام، اور رابسن وغیرہ نے بھی ابن اسحاق اور اس کی کتاب المغازی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔

## راویان سیرۃ ابن اسحاق

محمد ابن اسحاق کے شاگردوں میں سے پندرہ نے ان کی کتاب المبتداء والمبعث والمغازی کی روایت کی ہے۔ اس طرح اس کتاب کے تقریباً پندرہ مختلف نسخے یا

Versions سامنے آئے۔ اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ کوئی عالم حدیث، مغازی یافتہ کی کوئی کتاب مرتب کرتا، اس کا املا اپنے شاگردوں کو کراتا تھا۔ طلبہ اس کا املا لے کر یا تو اس کو حفظ کر لیا کرتے تھے یا اس کو نقل کر لیا کرتے تھے۔ یہ طلبہ آگے چل کر جب علم میں مزید ترقی کر لیتے تو اپنے شیخ کی کتاب میں اضافوں اور ترامیم کا سلسلہ جاری رکھتے۔ جہاں ان کو استاد (شیخ) کی رائے سے اختلاف ہوتا تو اس کا بھی ذکر کر دیا کرتے تھے۔ یوں ان کے شیخ کی کتاب کا ایک نیا نسخہ (Version) تیار ہو جاتا تھا، جو ان کے تلامذہ آگے روایت کرتے تھے، اور یہ سلسلہ مزید اضافوں اور ترامیم سے آگے بڑھتا رہتا تھا۔ اس کی ایک مثال موطاء امام مالک کی ہے۔ جس کے پندرہ بیس نسخے (Version) ہیں۔ ایک نسخہ ان کے شاگرد امام محمد کا ہے، اس میں امام محمد نے اپنی رائے کے مطابق بہت سے اضافے کیے ہیں، جہاں جہاں ان کو امام مالک کی رائے سے اختلاف تھا اس کو بیان کیا ہے، اپنے استاد امام ابوحنیفہ کے ارشادات بھی بیان کیے۔ وہ نسخہ اگرچہ موطاء امام مالک کا ہے لیکن ”موطاءے امام محمد“ کہلاتا ہے۔ یہی معاملہ متقدمین کی ہر بڑی کتاب کا تھا۔

اسی طرح سیرت ابن اسحاق کے پندرہ نسخوں کا تذکرہ ملتا ہے، ان میں سے ہر کتاب ایک علیحدہ ”کتاب المغازی“ کا حکم رکھتی ہے، اور ہر راوی، ”صاحب کتاب المغازی“ مانا جاتا ہے، درآں حالیکہ انہیں جدید دور کے حوالے سے مرتب (Editor) کہا جانا چاہیے۔ بہر حال ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے پندرہ راوی تھے جن کا اجمالی ذکر اس جدول سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نام راوی	محل سماع	سنہ ولادت	سنہ وفات
۱۔ ابراہیم بن سعد	مدینہ	۱۱۰ھ	۱۸۲ھ
۲۔ زیاد بن عبداللہ بکائی	کوفہ	-	۱۸۳ھ

۱۹۲ھ	۱۱۵ھ	کوفہ	۳- عبداللہ بن ادریس اودی
۱۹۹ھ	-	کوفہ	۴- یونس بن بکیر
۱۸۷ھ	-	کوفہ	۵- عبدة بن سلیمان
۱۹۹ھ	۱۱۵ھ	کوفہ	۶- عبداللہ بن نمیر
۱۹۳ھ	۱۱۳ھ	بغداد	۷- یحییٰ بن سعید اموی
۱۷۰ھ	۸۵ھ	بصرہ	۸- جریر بن حازم
-	-	بصرہ	۹- کریم بن ابی عیسیٰ
۱۹۱ھ	-	بصرہ	۱۰- سلمہ بن فضل ابرش
۱۸۹ھ	-	رے	۱۱- علی بن مجاہد
-	-	رے	۱۲- ابراہیم بن مختار
-	-	رے	۱۳- سعید بن بزیع
۱۹۱ھ	-	رے	۱۴- عثمان بن ساج
۱۹۱ھ	-	رے	۱۵- محمد بن سلمہ حرانی

ان میں سے بیشتر کا تذکرہ باب ششم میں کیا گیا ہے۔

## آثار علمیہ:

ابن اسحاق کی 'کتاب المبتداء والمبعث والمغازی' کے علاوہ درج ذیل کتب کا مختلف ذرائع سے پتہ چلتا ہے۔

۱- تاریخ الخلفاء: اس کتاب کا تذکرہ ابن الندیم نے کیا ہے ۱۱۱ اس کتاب کے چند اجزاء "مقتل عمر بن الخطاب اور لجنة الانتخاب" سے متعلق ہیں، عبدالعزیز الدوری نے شائع کیے ہیں۔ ۶۲

۲- کتاب الفتوح: الواقدی کی کتاب "فتوح مصر" اور "ارض ربیعہ"، "الفرس" کا بنیادی



ماخذ ابن اسحاق کی یہی کتاب الفتوح ہے۔

۳۔ اخبار کلیب و جساس: اس کا قلمی نسخہ بغداد میں ہے۔

۴۔ کتاب حرب البسوس بین بکرو تغلب: اس کے چند اجزاء طہران میں ہیں۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی ابن اسحاق سے منسوب ہیں

(الف) کتاب سیر العرب الاربع۔

(ب) حدیث اسراء والمعراج۔

(ج) اخبار صفین - ۶۳

لیکن ان کی نسبت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ البتہ ”حدیث اسراء والمعراج“

کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ اطلاع دیتے ہیں کہ اس کا ایک مخطوطہ طلعت کے کتب

خانے میں ہے جس کے کل اعداد ۲۹۳ اور اوراق ۳۸ تا ۶۵ ہیں اور اس کی تاریخ کتابت

۱۳۰۹ھ ہے ۶۲۔

الغرض محمد ابن اسحاق دوسری صدی ہجری کے بہت بڑے سیرت نگار تھے۔

انہوں نے جس مرتب اور مربوط انداز میں سیرت لکھی اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی، ان

کا انداز محدثانہ نہیں بلکہ مورخانہ تھا، جو محدثین کے نزدیک قابل اعتراض تھا، لیکن جب

اسی انداز میں سیرت اور تاریخ کی کتابیں لکھی جانے لگیں تو رفتہ رفتہ یعنی تیسری صدی

ہجری کے بعد سے حدیث اور تاریخ کے راستے جدا ہو گئے، اور علم تاریخ جو علم الحدیث

سے گندھا ہوا تھا، اس نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔

الغرض محمد ابن اسحاق مدنی اسکول کے ایسے نمائندہ سیرت نگار ہیں جنہوں نے

محدثین اور یہودی علماء کے مواد کو اکٹھا کرنے کی پہلی کوشش کی چنانچہ انہوں نے اپنی

کتاب المغازی میں احادیث تاریخی روایات، اسرائیلیات، عوامی قصوں، صحیح اور موضوع

اشعار کو جمع کیا جس کی وجہ سے فطری طور پر مدینہ کے روایت پسند علماء نے ان پر سخت

تنقید کی لیکن کوفہ اور بصرہ کے اخباری مدرسہ تاریخ میں، ان کو وہاں کے رجحانات سے میل کھانے کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا گیا اور پھر ابن ہشام کی تہذیب و تنقیح کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے محدثین نے بھی اپنی رائے بدل دی اور اس کو نہ صرف استحسان کی نظر سے دیکھا بلکہ اس کی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سیرت و تاریخ کی کتابوں کے بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ۶۵۔ بعد کے مورخین نے سیرت نبوی کے بارے میں اس کتاب پر پورا پورا اعتماد کیا چنانچہ امام طبری سے لے کر ابن خلدون تک ہر قابل ذکر مورخ نے ابن اسحاق سے بکثرت روایت کی ہے۔

المختصر ابن اسحاق کی سیرت اپنے فن میں ایک منفرد اور اساسی حیثیت رکھتی ہے اور بعد کے زمانے میں جس نے بھی سیرت کے موضوع پر قلم اٹھایا اسے ابن اسحاق کی خوشہ چینی کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ ابن اسحاق کے بارے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: ”ابن اسحاق کو علم سیرت سے وہی نسبت ہے جو حکیم ارسطو تالیس کو علم منطق سے، امام شافعی کو علم اصول فقہ سے اور غلیل بن احمد افرہیدی کو علم عروض سے ہے۔ ابن اسحاق سے پہلے فن سیرت موجود تھا، علم سیرت کا سارا مواد بھی موجود تھا، لیکن ابن اسحاق نے اس کو انتہائی مربوط خطوط پر استوار کیا، اس انداز سے مرتب کیا کہ بعد میں آنے والا ہر شخص ان کا ممنون احسان ہے“۔ ۶۶۔

## حواشی و حوالہ جات (باب پنجم، فصل اوّل)

- ۱۔ مبارک پوری، قاضی اطہر 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۱۲۶ (دارالانوار، لاہور، ۲۰۰۵)۔
- ۲۔ صدیقی، علی محسن (مقدمہ) کتاب المعارف، ص ۳۲ (قرطاس، کراچی، ۱۹۹۹ء)۔
- ۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۴، ص ۲۳۱ (دانش گاہ پنجاب، لاہور ۲۰۰۲)۔
- ۴۔ ایضاً۔
- ۵۔ صدیقی، علی محسن، ص ۳۲۔
- ۶۔ امام بخاری نے (تاریخ کبیر میں) ابن اسحاق کی کنیت 'ابوبکر' بتائی جبکہ ابن اسعد نے (طبقات میں) ان کی کنیت ابو عبد اللہ لکھی ہے۔
- ۷۔ ابن قتیبہ "عبدالمطلب" کی جگہ "عبدمناف" لکھتے ہیں۔ دیکھئے ابن قتیبہ، المعارف، ص ۲۱۵۔
- ۸۔ الفہرست، ص ۱۲۱۔
- ۹۔ ایضاً۔
- ۱۰۔ حمید اللہ، "محاکمہ" سیرت ابن اسحاق، مشمولہ نقوش، رسول نمبر جلد ۱۱، ص ۳۷۵ (ادارہ طلوع اسلام، لاہور)۔
- ۱۱۔ محمد، حمید اللہ "محاکمہ"، ص ۳۷۵۔
- ۱۲۔ محاکمہ، ص ۳۷۶۔
- ۱۳۔ ایضاً۔
- ۱۴۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ابو داؤد نے کہا کہ محمد ابن اسحاق قدری معتزلی تھے۔ (دیکھئے جلد ۳، ص ۲۱)۔
- ۱۵۔ تاریخ بغداد جلد ۱، ص ۲۲۳ طبع مصر۔
- ۱۶۔ معجم الادباء (یعنی ارشاد الاریب) مادہ ابن اسحاق۔
- ۱۷۔ حمید اللہ، "محاکمہ"، ص ۸۰-۳۷۹۔

- ۱۸۔ اس پر سیر حاصل بحث ڈاکٹر حمید اللہ نے محاکمہ میں کی ہے (دیکھئے محاکمہ سیرت ابن اسحاق، مشمولہ، نقوش رسول نمبر جلد ۱۱، ص ۳۷۹ تا ص ۳۸۵)۔
- ۱۹۔ ابن حجر عسقلانی کے مطابق وہ ۱۱۹ھ میں اسکندریہ آئے تھے دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۹، ص ۴۴۔
- ۲۰۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ 'محاکمہ'، ص ۳۷۶۔
- ۲۱۔ ابن قتیبہ المعارف، ص ۲۱۵۔
- ۲۲۔ مہدی تیسرا عباسی خلیفہ تھا۔ ۱۲۱ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے والد ابو جعفر المنصور کے خلیفہ ہونے پر وہ چودہ پندرہ سالہ نوجوان تھا۔
- ۲۳۔ ابن خطیب بغدادی تاریخ بغداد جلد ۱، ص ۲۲۱۔
- ۲۴۔ سلمہ بن الفضل کا تذکرہ باب ششم میں آرہا ہے۔
- ۲۵۔ جوزف ہوردوئس 'سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین، ص ۷۱ (مشمولہ نقوش)۔
- ۲۶۔ تاریخ وفات کے حوالے سے دیگر معلومات کے لیے دیکھئے حمید اللہ، محاکمہ، ص ۳۷۵۔
- ۲۷۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۰۹۔
- ۲۸۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۱۵۱۔
- ۲۹۔ ایضاً
- ۳۰۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۰۹۔
- ۳۱۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۱۵۱۔
- ۳۲۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۰۹۔
- ۳۳۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔
- ۳۴۔ ذہبی، تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۱۵۱۔
- ۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ 'محاکمہ'، ص ۳۷۷۔

۳۸۔ تذکرہ الحفاظ، ص ۱۵۱۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ محاکمہ، ص ۳۸۶۔

۴۱۔ یہ ایک طویل بیان ہے دیکھئے جلال الدین سیوطی 'تاریخ الخلفاء' مترجم شبیر احمد

انصاری، ص ۳۶۲ تا ۳۶۴ (مکہ پبلشنگ کمپنی، لاہور۔ ت ن)۔

۴۲۔ عسقلانی، ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۹، ص ۴۴، ۴۵۔

۴۳۔ جوزف ہورودٹس، ص ۷۶۳۔

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ قرآن میں اصحاب بدر کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ صحابہ کرام میں ان کی فضیلت

معروف و مشہور تھی بعد کے ادوار میں بھی اہل بدر کو ہمیشہ امتیازی مقام حاصل رہا یہاں

تک کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اصحاب بدر کو ایک انتخابی ادارہ Electoral

college کی حیثیت حاصل تھی۔ خلفاء کا انتخاب اصحاب بدر ہی کیا کرتے تھے۔ جب

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت علی سے کہا کہ آپ خلیفہ بن جائیں تو

آپ نے ان سے کہا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں نہیں ہے یہ فیصلہ کرنے کا حق تو اہل

بدر کو ہے جس سے اصحاب بدر راضی ہوں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ (غازی، محمود احمد 'محاضرات

سیرت'، ص ۱۷۱، الفیصل، لاہور ۲۰۰۸)

۴۶۔ محاضرات سیرت، ص ۱۷۳۔

۴۷۔ جوزف ہورودٹس، ص ۷۶۳۔

۴۸۔ ایضاً۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۷۶۵۔

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۷۶۵۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۷۶۴۔

۵۳۔ ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ) 'عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر' جلد ۱، ص ۱۰ (طبع مصر)۔

۵۴۔ تاریخ بغداد جلد ۱، ص ۲۳۰۔

۵۵۔ محاکمہ، ص ۳۸۶۔

۵۶۔ ایضاً۔

۵۷۔ جوزف ہورودٹس، ص ۷۶۷۔

۵۸۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ رسول اکرم کے سیرت نگار، مشمولہ نقوش، سیرۃ نمبر جلد ۱، ص ۷۰۹۔

۵۹۔ محاضرات سیرت، ص ۲۸۲۔

۶۰۔ جوزف ہورودٹس، ص ۷۶۷۔

۶۱۔ ابن الندیم، محمد ابن اسحاق کی صرف دو کتابوں کا تذکرہ کرتا ہے ایک کتاب المبتداء

والمبعث والمغازی اور دوسری یہی تاریخ الخلفاء (ابن الندیم الفہرست، ص ۱۶۱)۔

۶۲۔ فواد سیزگین، ص ۱۶۷۔

۶۳۔ یہ ساری معلومات فواد سیزگین اپنی کتاب "تاریخ التراث العربی" کی جلد دوم میں

دیتے ہیں، جس کے ایک جزو کا ترجمہ شیخ نذیر حسین صاحب نے کیا اور "سیرت نگاران

نبوی" کے عنوان سے معارف اعظم میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ پہلی قسط اگست ۹۳ء

کے شمارے میں اور دوسری قسط ستمبر ۹۳ء کے شمارے میں موجود ہے۔

۶۴۔ محاکمہ، سیرت ابن اسحاق، ص ۳۸۷۔

۶۵۔ ندوی، ڈاکٹر مسعود الرحمن خان 'ابن کثیر' مشمولہ نقوش سیرۃ نمبر، جلد ۱، ص ۶۶۳۔

۶۶۔ محاضرات سیرت ۲۵۹۔

## محمد بن عمر الواقدی

دور ثانی میں دوسرے اہم سیرت نگار محمد بن عمر الواقدی ہیں، بظاہر واقدی متنازعہ نظر آتے ہیں، علماء میں سے ایک جماعت ان پر کذب کا الزام لگاتی ہے اس کے باوجود ان کو دور ثانی کے تین اہم ترین سیرت نگاروں میں جگہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ تمام الزامات کے باوجود مورخین ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے، بعد میں آنے والے مورخین نے ان کی معلومات سے خوب فائدہ اٹھایا، اس کو مرتب کیا، ان مرتبین پر نہ کذب کا الزام ہے نہ انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ واقدی پر الزامات کا سبب کچھ اور تھا، جس پر آگے روشنی ڈالی جائیگی۔ یہ بہر حال طے ہے کہ سیرت نگاری جب ارتقائی شکل میں دوسرے دور میں داخل ہوئی تو جن سیرت نگاروں نے سیرت نگاری کے خام مواد سے اس کو ایک فن کی حیثیت دی اس میں اولین نام محمد بن اسحاق کا اور دوسرا نام واقدی ہی کا آتا ہے۔

## حالات زندگی:

ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن واقد سلمی، اپنے دادا ”واقد“ کی نسبت سے واقدی اور قبیلہ سلم کی شاخ بنو سہم کے عبد اللہ بن ابی بریدہ سے نسبت ولایت کی بناء پر ”اسلمی“ مشہور ہیں۔ واقدی ۱۳۰ھ / ۷۴۷ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے یہ آخری مروانی خلیفہ مروان ثانی کا ہنگامہ خیز دور حکومت تھا اور ۲۰۷ھ / ۸۲۳ء میں بغداد میں وفات پائی، ان کی نماز جنازہ محمد بن سہم تمیمی نے پڑھائی جو مغربی بغداد کے قاضی تھے ۲ اور خیزران

کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ۳

واقدی کے دادا جو مد کے بنو اسلم کے ایک گندم فروش عبداللہ بن ابی بریدہ کے مولیٰ تھے، خود بھی گندم فروشی کے پیشے سے وابستہ تھے، واقدی کا ذریعہ معاش بھی گندم فروشی ہی تھا لیکن اپنے جو دوستوں کی وجہ سے ہمیشہ تنگ دست ہی رہے اور کئی بار ان کا قرضہ خلیفہ وقت کی طرف سے ادا کیا گیا، یہاں تک کہ جب وہ انتقال کر گئے تو ان کے کفن دفن کا انتظام مامون الرشید نے کیا، درآں حالیکہ اس وقت وہ بغداد کے ایک حصہ کے قاضی تھے۔ ۴ خود واقدی کا بیان ہے کہ انہیں عباسی خلیفہ مامون الرشید کی جانب سے ایک بار چھ لاکھ درہم ملے، مگر اس سال بھی ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی۔ خطیب بغدادی ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”وکان جواداً کریماً مشهوراً بالسخاء“۔ ۵

واقدی نے اپنی زندگی کے ابتدائی پچاس سال مدینہ میں گزارے، جب مالی مسائل کا شکار ہوئے تو ۱۸۰ھ میں بغداد گئے اور زندگی کے باقی چھبیس ستائیس سال بغداد میں ہی گزارے اور وہیں وفات پا کر مدفون ہوئے۔

مدینہ میں انہوں نے ابن جریج، امام اوزاعی، ابن ابی ذئب، مالک بن انس، سفیان ثوری، ربیعۃ الرای، ابو معشر سندی، اور امام زہری کے بھتیجے محمد بن عبداللہ وغیرہ سے روایت کی۔ ان کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے بہر حال ان سے ان کے شاگرد خاص محمد بن سعد (کاتب الواقدی) ابو حسان زیادی، محمد بن اسحاق صنعانی، احمد بن حنبل، برجلانی، عبداللہ بن حسن ہاشمی، ابو بکر بن ابی شیبہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۶

بغداد جانے سے پہلے واقدی مدینہ میں مسجد نبوی میں باقاعدہ مغازی کا درس دیتے تھے۔ حصول علم کے لیے واقدی نے بڑی سخت محنت کی، وہ غزوات کے مقامات کا مشاہدہ خود جائے وقوع پر جا کر کیا کرتے تھے، ان کا اپنا بیان ہے کہ میں صحابہ اور شہداء کی اولاد میں سے اور ان کے موالی میں سے جس کو پا جاتا اس سے دریافت کرتا کہ کیا



آپ نے اپنے خاندان کے کسی شریک غزوہ سے کوئی خبر سنی ہے اور اگر کوئی شہید ہوا ہے تو کہاں؟ اور جب کوئی بات معلوم ہوتی تو جائے وقوع پر جا کر تحقیق کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے مرسیع جا کر وہاں کا منظر دیکھا۔ اسی طرح جس غزوہ کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی خود جا کر وہاں کا معائنہ کرتا تھا۔ ہارون قروری کہتے ہیں کہ میں نے واقدی کو مکہ میں دیکھا کہ پانی کا برتن لیے کہیں جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ بولے حنین جانا چاہتا ہوں کہ غزوہ حنین کی جائے وقوع اور اس کی نوعیت معلوم کروں۔ ۸

چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے واقدی کی شہرت اسلامی تاریخ، رجال و طبقات، اور سیر و مغازی کے عالم کے طور پر ہو چکی تھی کیونکہ ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں جب عباسی خلیفہ ہارون الرشید حج کے بعد مدینے کی زیارت کے لیے آیا تو مدینے کے مقامات مقدسہ، مشاہد، شہداء کے مقابر وغیرہ کی زیارت کرانے کے لیے جب کسی عالم کی تلاش ہوئی تو واقدی ہی کا نام سامنے آیا۔ چنانچہ جب خلیفہ اور اس کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی نے مقامات مقدسہ کی زیارت کی تو واقدی نے ان کے رہنما کے فرائض انجام دیئے، جس پر خوش ہو کر ہارون الرشید نے واقدی کو دس ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔ ۹ اس موقع پر خالد برمکی نے واقدی کو دعوت دی کہ ہم جہاں بھی ہوں اگر آپ ملاقات کرنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔

اس پیش کش سے انہوں نے دس سال بعد فائدہ اٹھایا جب ۱۸۰ھ میں وہ سخت مالی مشکلات میں پھنس گئے تو اپنی بیوی ام عبداللہ کے مشورے سے خلیفہ اور اس کے وزیر خالد برمکی سے ملاقات کے لیے پہلے بغداد ازاں بعد رقبہ پہنچے، جہاں ان دنوں ہارون الرشید مقیم تھا، یحییٰ بن خالد برمکی نے اس کی بڑی ادبگت کی اور اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا، خلیفہ نے مدینہ کا سفر یاد کر کے اسے تحائف سے مالا مال کر دیا ۱۰ واقدی ہمیشہ یحییٰ بن خالد برمکی کے مداح رہے۔

جب وہ بغداد منتقل ہو گئے تو انہیں آسودہ حالی کی زندگی ملی۔ ہارون کے زمانے میں مشرقی بغداد اور مامون کے زمانے میں رصافہ میں قاضی عسکر مقرر کیا گیا۔ خلیفہ مامون کے ساتھ بھی واقدی کے تعلقات بہت گہرے تھے، انہوں نے خلیفہ کو اپنا وصی مقرر کیا تھا لہذا جب واقدی کا انتقال ہوا تو آخری رسومات کی کفالت مامون ہی نے کی۔ واقدی نے برامکہ کے زوال کے بعد بھی یحییٰ برکی کے ساتھ اپنی احسانمندی کے اظہار میں کبھی اخفا سے کام نہیں لیا۔

یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ واقدی نے اپنی کتاب المغازی کہاں لکھی لیکن یہ ضرور ہے کہ بغداد میں جہاں انہیں فارغ البالی نصیب ہوئی تو ان کے تصنیف و تالیف کے کام میں یقیناً تیزی آئی ہوگی۔ واقدی کے ہاں دو آدمی کتابیں لکھنے اور نقل کرنے پر مامور تھے۔ واقدی اپنے عہد کے زیادہ سے زیادہ علوم حاصل کرنے کے شائق تھے چنانچہ جتنی کتابیں بھی انہیں مل سکیں انہوں نے سب کی نقلیں تیار کرائیں ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جب وہ بغداد کے مغربی علاقے سے مشرقی علاقے میں منتقل ہوئے تو ایک سو بیس اونٹوں پر ان کی کتابیں لادی گئی تھیں۔ وفات کے بعد چھ سو بورے کتابیں چھوڑیں، ہر بورے میں دو آدمیوں کے بوجھ بھر کتابیں تھیں۔ ایک مرتبہ ان کی کچھ کتابیں دو ہزار دینار میں فروخت بھی ہوئیں۔ ۱۱

ابن الندیم 'الفہرست' میں واقدی کو شیعہ بتاتے ہیں، ایسا معتدل شیعہ جو تقیہ کیے رہتا تھا۔ ابن الندیم نے واقدی کی یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام، اسی طرح رسول اللہ کا معجزہ ہیں جس طرح عصا، موسیٰ علیہ السلام کا اور مردوں کو جلا دینا (احیاء موتی) عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ ۱۲

ابن الندیم پہلا اور تنہا مؤلف ہے جس نے واقدی کو شیعہ بتایا ہے حتیٰ کہ یحییٰ کی کتب رجال میں بھی اس کا نام نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح سے اس کی تحریروں میں

حضرت علی کی طرف غیر معمولی رجحان بھی نظر نہیں آتا مثلاً حضرت علی کے بارے میں رسول اللہ کے تعریفی کلمات جو ابن اسحاق کے یہاں ملتے ہیں، واقدی نے یا تو نقل ہی نہیں کیے یا انہیں ہلکا کر کے پیش کیا ہے چنانچہ واقدی نے حضرت علی کے بارے میں رسول اللہ کا یہ ارشاد نقل نہیں کیا جو ابن اسحاق کی سیرۃ میں موجود ہے۔ ”اے علی کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہارا وہی درجہ ہے جو ہارون کا موسیٰ کے ساتھ تھا۔“

اسی طرح وہ کلمات جو رسول اللہ نے سورہ توبہ نازل ہونے کے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جو ابن اسحاق نے نقل کیے ہیں۔ ”تبلیغ رسالت کا کام میرے اہل بیت میں سے صرف ایک شخص پورا کرے گا۔“ حضرت علی کی منقبت کے کلمات کو حذف کر دینا یا انہیں ہلکا کر کے پیش کرنا ایک ایسے مولف سے حیرت انگیز ہے جسے شیعیت سے متصف کیا جاتا ہو ۱۳۱ نثار احمد فاروقی ایک اور بات کا اضافہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں ابن اسحاق نے یوم بدر کے مقتولین کی فہرست میں لکھا ہے کہ طعیمہ بن عدی کو حضرت علی نے قتل کیا، مگر واقدی اس کی تردید کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ طعیمہ کو قتل کرنے والے حضرت حمزہ تھے، علی نہیں۔ اسی طرح یوم احد میں صواب کو کس نے قتل کیا اس میں اختلاف روایات ہے، تین نام لیے جاتے ہیں کوئی کہتا ہے صواب کو سعد بن ابی وقاص نے قتل کیا، کوئی حضرت علی کا نام لیتا ہے اور کوئی قزمان کا۔ واقدی کہتے ہیں صواب کو قزمان نے قتل کیا۔ ۱۳۲ اگر اس کی تاویل میں یہ بات کہی جائے کہ وہ تقیہ کیے ہوئے تھے، تو تقیہ کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ وہ عباسی حکمران خصوصاً مامون الرشید کے مقرب تھے، جس کا شیعیت کی طرف رجحان تاریخی حقیقت ہے۔ لہذا واقدی کو شیعہ قرار دینے کے لیے تنہا ابن الندیم کا قول نا کافی ہے جبکہ اسی کا معاصر الطوسی اس بات کا قطعی ذکر نہیں کرتا۔

## حکمرانوں کے ساتھ تعلقات:

واقدی جب پیدا ہوئے تو خلافت بنو امیہ کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

مروان ثانی کا بڑا پر فتن دور چل رہا تھا، خراسان میں عباسی دعوت عروج پر تھی۔ واقدی کی عمر جب فقط دو سال تھی تو بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا، عباسی برسر اقتدار آ گئے، آنے والے چند سالوں میں مرکز حکومت بغداد منتقل ہو گیا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بغداد کی محض سیاسی و فوجی اہمیت ہی میں اضافہ نہ ہوا بلکہ علمی اور فکری مرکز کے طور پر بھی بغداد نے خود کو منوانا شروع کر دیا۔ ابتدائی چار عباسی خلفاء، یعنی السفاح، المنصور، المہدی اور الہادی کا زمانہ وہ تھا جب واقدی دلجمعی کے ساتھ مدینہ میں مقیم تھے اور حصول علم اور درس و تدریس میں مصروف تھے۔

حکمرانوں کے ساتھ ان کا پہلا تعلق ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں ہوا جب پانچواں عباسی خلیفہ ہارون الرشید اپنی بیعت کے پہلے ہی سال حج کے لیے آیا اور جب مدینہ کی زیارت کے لیے پہنچا تو مقامات مقدسہ کی زیارت واقدی نے کرائیں، تفصیلات صفحات سابقہ میں گزر چکی ہیں۔ اس کے بعد دس سال تک پھر واقدی کا دربار خلافت یا عمال خلافت سے کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ان کے مالی مسائل نے انہیں مجبور کیا کہ وہ یحییٰ بن خالد برمکی، جو ہارون الرشید کا وزیر تھا، سے ملاقات کریں۔ یہ ملاقات رقبہ میں ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء میں ہوئی اور وزیر اعظم نے اور خلیفہ دونوں نے واقدی کی آدبگت کی اور بیش بہا انعامات و عطیات سے نوازا۔ اس سے حوصلہ پا کر وہ بغداد گئے جہاں ازاں بعد ہارون الرشید نے انہیں مشرقی بغداد کا قاضی بنا دیا۔ مامون کے زمانے میں وہ 'رصاصہ' میں قاضی عسکر مقرر ہوئے خلیفہ مامون الرشید کے ساتھ واقدی کے گہرے مراسم تھے، واقدی اپنے جو دو سخا کی وجہ سے مقروض ہو جایا کرتے اور مامون ان کا قرض اتارا کرتا۔ یہاں تک کہ جب واقدی کا انتقال ہوا، اور ان کے کفن و دفن کے لیے رقم فراہم نہ ہو سکی تب بھی مامون الرشید نے یہ اخراجات اٹھائے۔

جوزف ہو رووٹس کہتے ہیں کہ واقدی نے حکمران خاندان کا احترام ملحوظ خاطر

رکھا، یہ حکمران خاندان کا احترام ہی تھا کہ اس نے بدر میں گرفتار ہونے والے دشمنان رسول کی فہرست میں سے حضرت عباس کا نام حذف کر دیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے مشرکین قریش کے لشکر کو سامان رسد فراہم کیا تھا ان کی فہرست میں عباس (بن عبدالمطلب) کی جگہ صرف ”فلاں“ لکھا ہے۔ اسی طرح یہ قول بھی حاکموں کو خوش کرنے کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے بیت المال سے وظیفہ پانے والوں کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں سب سے پہلا نام عباس کا تھا۔ ۱۵

## واقدی کے بارے میں اقوال علماء:

واقدی باوجود اس کے کہ حدیث، فقہ، تفسیر، سیر و مغازی، تاریخ، اخبار اور رجال و طبقات کے جامع عالم تھے ان کے بارے میں موافقانہ اور مخالفانہ دونوں طرح کے بیانات ملتے ہیں لہذا اس کا ایک جائزہ لینا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

واقدی کے بارے میں ان کے شاگرد رشید محمد ابن سعد کہتے ہیں ”واقدی مغازی، سیرت، فتوح، حدیث و احکام اور علماء کے اختلاف و اجتماع کے عالم تھے“۔ ۱۶

ابن خطیب بغدادی کا بیان ہے ”وہ (واقدی) ان لوگوں میں سے ہیں جن کا چرچا مشرق و مغرب پر چھایا ہوا ہے اور اخبار و احداث کی واقفیت میں ان کا مرتبہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے اور ان کی کتابوں کو اہل علم قافلہ در قافلہ اپنے اپنے شہروں میں لے گئے جو مختلف علوم و فنون میں ہیں یعنی مغازی اور سیر اور طبقات، اور رسول اللہ ﷺ کے واقعات و اخبار جو آپ کی حیات میں اور آپ کی وفات کے بعد ظاہر ہوئے، اور فقہ اور اختلاف علماء اور حدیث وغیرہ پر مشتمل ہیں، واقدی دریا دل، کریم اور مشہور نخی تھے۔ ۱۷

ابن خلکان کا کہنا ہے۔ ”واقدی امام عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے“ ۱۸

علامہ شمس الدین الذہبی نے واقدی کو ”صاحب التصانیف و المغازی،

العلامة، الامام، احدا و عیة العلم“ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ۱۹

ابن الندیم نے علماء کا قول نقل کیا ہے کہ ”ابو مخنف عراق کے اخبار و فتوح کے علم میں دوسرے سے آگے ہیں اور مدائنی خراسان، ہند اور فارس کے بارے میں دوسرے سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور واقدی حجاز اور سیرت کے علم میں سب سے برتر ہیں جبکہ شامی فتوحات کے علم میں تینوں علماء برابر ہیں۔“ ۲۰

ابراہیم بن اسحاق حربی جو حدیث و مغازی کے زبردست عالم اور کتاب المغازی کے مصنف ہیں، ان کا بیان ہے کہ احمد بن حنبل ہر جمعہ کو محمد بن سعد، کاتب الواقدی کے پاس حنبل بن اسحاق کو بھیج کر واقدی کی احادیث کے دو جزو منگاتے تھے اور دوسرے جمعہ تک ان کو دیکھ کر واپس کرتے تھے اور دوسرے دو جزو منگواتے تھے، حالانکہ اگر احمد بن حنبل خود محمد ابن سعد کے یہاں جا کر ان کا سماع کرتے تو بہتر ہوتا۔“ ۲۱ امام حربی نے ان کے بارے میں کہا ہے ”واقدی مسلمانوں کے سب سے بڑے علمی امانت دار تھے“ ۲۲ ابراہیم حربی کہتے تھے ”اگر مالک ابن انس اور ابن ابی ذؤب کے مسائل واقدی کے سوا کسی اور راوی کے ذریعہ سے آئیں تو ان کی تصدیق مت کرو“۔ ۲۳ جبکہ مشہور محدث علامہ دراوردی کا تو یہاں تک بیان ہے کہ ”ذاک امیر المومنین فی الحدیث“۔ ۲۴ ابن العماد حنبلی نے انہیں ”علم کا ظرف“ قرار دیا ہے۔

واقدی کے ایک ہمعصر محمد بن سلام جمحی ایک مشہور مورخ اور ادیب تھے ان کی مشہور کتاب ”طبقات الشعراء“ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ”کان الواقدی عالم دھرہ“۔ واقدی اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تھا۔ ۲۵

مصعب بن زبیر کا کہنا ہے ”واللہ ہم نے واقدی جیسا دوسرا نہیں دیکھا اور یہ بھی کہا کہ ”واقدی ثقہ اور مامون ہے“ ۲۶ یزید بن ہارون نے کہا کہ واقدی ثقہ ہے۔ اس کے ثقہ ہونے کی تصدیق ابو عبید قاسم بن سلام نے بھی کی ہے ۲۷ مشہور مورخ اور سیرت نگار ابن کثیر (۷۰۱ھ / ۷۷۳ء) بھی واقدی کو تاریخ کے بڑے اماموں میں شمار

کرتے ہیں اور ان کی قدر دانی میں بخل سے کام نہیں لیتے بلکہ سیرت کے حصہ میں ان کی روایات و اقوال ابن اسحاق کی روایات کے درمیان بکثرت نقل کرتے ہیں۔ ۲۸

دوسری طرف ان کے خلاف بھی بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ خصوصاً وہ محدثین کے نزدیک ثقہ نہیں ہیں۔ امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام نسائی نے ان کے خلاف بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ ۲۹ امام احمد بن حنبل کے نزدیک وہ کذاب ہے جو حدیث کو پلٹ دیتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک واقدی کی روایات سب کی سب جھوٹی ہیں کیونکہ وہ اسناد گھڑ کر بیان کرنے کا عادی تھا۔ امام نسائی کی رائے میں واقدی ایسے کذابوں میں سے تھا جن کے جھوٹ کا سب کو علم ہے ۳۰ امام ابو عبد اللہ محمد ذہبی، صاحب تذکرۃ الحفاظ لکھتے ہیں ”واقدی علم کا سمندر ہیں۔ چونکہ ان کی حدیث ترک کرنے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے اس لیے میں نے ان کے حالات یہاں ذکر نہیں کیے، بلاشبہ علم کا خزانہ ہیں لیکن حدیث میں غیر محفوظ ہیں۔ مغازی اور سیر میں چوٹی کے عالم ہیں۔ لائق اور نالائق ہر قسم کے لوگ سے روایت کرتے ہیں۔“ ۳۱

دونوں طرح کی آراء کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقدی حدیث میں ضعیف اور تاریخ میں مستند ہیں اور یہ بات صرف واقدی پر چسپاں نہیں ہوتی بلکہ محمد ابن اسحاق اور دوسرے علمائے سیر و مغازی اور اہل اخبار و احداث کو بھی احکام میں حجت نہیں مانا گیا ہے، لیکن انہیں سیر و مغازی اور تاریخ و رجال کا امام مانا گیا ہے۔ سیر و مغازی، انساب، اخبار، تاریخ رجال، طبقات اور حدیث کے تقریباً تمام مصنفین ان کے محتاج ہیں اور واقدی کے اقوال و روایات کے بغیر ان کی کتاب مکمل نہیں ہوتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کے شاگرد محمد بن سعد کے ذریعہ ان کی روایتوں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جاتا ہے، اور استاد کو کذاب اور داستان گو کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ’فتوح الشام‘ اور ’فتوح مصر‘

وغیرہ کو واقدی کی کتاب سمجھ کر اور ان سب میں غلط واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر واقدی کو وہ سب کچھ کہا اور لکھ دیا جو ایک پھلکرو داستان گو کو لکھا اور کہا جاسکتا ہے۔ اور اب وہی مستشرقین تحقیق کر کے اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتابیں واقدی کی طرف غلط طور پر منسوب ہو گئی ہیں اور ان کی تصانیف نہیں ہیں۔ ۳۲۔

المختصر واقدی، جنہوں نے ابن اسحاق کے مقابلے میں زیادہ احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی، انہیں بھی محدثین نے کم از کم احکام کے مسائل میں ضعیف گردانا لیکن سیرت و مغازی اور فتوح و فقہ میں ان کو قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔

## واقدی کی کتاب المغازی:

ابن الندیم نے الفہرست میں اور یاقوت حموی نے معجم الادباء میں واقدی کی ۲۸ تصانیف کے نام دیئے ہیں۔ ۳۳۔ ان میں سے چار کتابوں کا تعلق سیرت نبوی یا اس سے متعلقہ موضوعات سے ہے:

۱۔ کتاب التاريخ و المغازی و المبعث

۲۔ کتاب السیرة

۳۔ کتاب ازواج النبیؐ

۴۔ کتاب وفاة النبیؐ

تاہم بہ حیثیت سیرت نگار واقدی کی سیرت کا دارومدار ان کی کتاب التاريخ و المغازی و المبعث پر ہے۔ جو عام طور پر ”کتاب المغازی“ کے نام سے معروف ہے اور اپنی مکمل شکل میں آج بھی مل جاتی ہے۔ فن مغازی پر واقدی کی یہ کتاب خاصی ضخیم ہے یہ کتاب لکھتے ہوئے جن مصنفین سے واقدی نے استفادہ کیا ان میں موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد، اور ابو معشر سندی ہیں جو صاحبان کتب المغازی ہیں۔ تاہم واقدی نے ان سب سے زیادہ اخذ و استفادہ اپنے پیش رو محمد ابن اسحاق سے کیا ہے، اگرچہ اس نے اپنی



کتاب المغازی میں ابن اسحاق کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ترتیب و تہویب میں ابن اسحاق کی پیروی کی ہے۔ ۳۴

واقدی نے کتاب المغازی کا مواد مدینہ میں رہ کر اپنے اساتذہ سے حاصل کیا تھا۔ اس کتاب کا موضوع اگرچہ غزوات نبوی کا بیان ہے لیکن اس میں مکہ اور مدینہ کی ابتدائی تاریخ بھی محفوظ ہوگئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات اور حضرت ابو بکر صدیق کی بیعت وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب رسول اللہ کی مدنی زندگی سے متعلق ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ واقدی کی کتاب المغازی میں، جنگوں، مہمات اور غزوات کے بیان کے پہلو بہ پہلو اس عہد کی معاشرتی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کی تفصیلات بھی ملتی ہیں، جس نے کتاب کو بے انتہا دلچسپ بنایا ہے۔ واقدی فراہمی معلومات اور اسلوب میں، ابن اسحاق کے مقابلے میں زیادہ دقت نظر کا ثبوت دیتے ہوئے مدنی مدرسہ کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ’کتاب المغازی‘ کے شروع میں واقدی نے اپنے پچیس راویوں کی فہرست درج کی ہے، جن میں سے گیارہ کے بارے میں ابن سعد کی رائے ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ ان میں زہری، معمر بن راشد، ابو معشر سندھی اور موسیٰ بن عقبہ کے نام نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ان تمام مصادر سے استفادہ کیا ہے جن تک ان کی رسائی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی مدنی زندگی کے بارے میں واقدی کی کتاب ابن اسحاق کی کتاب المغازی سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ جوزف ہورووٹس کہتے ہیں ’واقدی نے ابن اسحاق کے علاوہ بھی ان تمام مصادر سے استفادہ کیا تھا جن کا حصول کسی طرح بھی اس کے لیے ممکن تھا۔ اس کے یہاں وہ بہت کچھ ہے جو ابن اسحاق کے یہاں بھی نہیں ملتا یا کم از کم ابن اسحاق نے ان راویوں کے حوالے سے بیان نہیں کیا ہے جن کا نام الواقدی لکھتا ہے۔ چنانچہ مدنی زندگی کے اخبار و حوادث میں اس کی تالیف ابن اسحاق کی کتاب سے زیادہ جامع ہے۔‘ ۳۵

تاہم ایک اور بات جو مانتی پڑے گی وہ یہ کہ محمد ابن اسحاق نے تاریخ رسالت بھی بیان کی اور عہد جاہلیت پر بھی بہت معلومات فراہم کیں، جبکہ واقدی نے ان دونوں موضوعات کی طرف اپنی کتاب المغازی میں کوئی توجہ نہیں دی۔ واقدی نے اپنی کتاب میں رسول اللہ کے بعض احکام اور معاہدے بھی درج کیے ہیں، جہاں تک ان کے لیے ممکن ہوا وہ بنیادی مسودات، وثائق اور دستاویزات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ واقدی واقعات کے قلم بند کرنے میں ایک خاص طریق کار اختیار کرتے ہیں جو کسی اور مصنف نے ان سے پہلے استعمال نہیں کیا۔ مثلاً غزوات نبوی کے سلسلہ میں وہ سب سے پہلے فوجوں کی روانگی اور واپسی کی تاریخیں ترتیب کے ساتھ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مختلف راویوں کے بیانات کی روشنی میں ایک بیانیہ تحریر کرتے ہیں جس سے واقعہ کی مکمل تصویر اپنی جزئیات سمیت روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ علاوہ ازیں واقدی جا بجا قرآن مجید سے بھی ایسی آیات بطور شہادت نقل کرتے ہیں جن کا زیر بحث واقعہ سے خاص تعلق ہو۔

واقدی کا یہی اسلوب ان کو معتبور شہرانے کا سبب بن گیا۔ محدثین نے اسی اسلوب کی بنیاد پر انہیں کاذب اور غیر معتبر کہا۔ واقدی عام طور سے قریب اللفظ اور قریب المعنی روایتوں کو ان کی سندوں کے ساتھ الگ الگ بیان نہیں کرتے بلکہ راویوں کا نام لے کر واقعہ بیان کرتے ہیں جو محدثین کے طریقے کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ ہر راوی کی روایت کو اس کی سند سے بیان کرتے ہیں اور اس کو مستقل حدیث قرار دیتے ہیں یہ ان کی شدت احتیاط ہے۔ مگر مورخین نے عموماً ایسا نہیں کیا، کیونکہ اس سے ایک تو بیانیہ غیر ضروری طور پر طویل ہو جاتا ہے، دوسرے واقعہ کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔

یوسف بن ابراہیم سستی نے واقدی کے اسی طرز عمل پر اعتراض کیا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے واقدی سے کہا کہ بعض لوگ بہت سے راویوں کی سندوں کو یکجا کر کے مشترک واقعات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس سے روایات میں تمیز

نہیں ہوتی کہ کون سا قول کس راوی کا ہے۔ بہتر ہو کہ آپ ہر راوی کی روایت کو اس کی سند سے علیحدہ علیحدہ بیان کریں، واقدی نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں بہت طوالت ہوگی۔ ہم نے اس پر رضامندی ظاہر کی تو وہ تقریباً ایک ہفتے کے لیے مجلس درس سے غائب ہو گئے اور جب ایک ہفتہ بعد مجلس درس میں آئے تو اپنے ساتھ صرف غزوہ اُحد کے بارے میں بیس اجزاء اور بعض روایات میں ہے کہ سوا اجزاء لکھ کر لائے۔ یہ دیکھ کر ہم نے ان سے کہا آپ حسب سابق تمام رواۃ و اسناد کو یکجا کر کے مختصر طور سے بیان کیا کریں۔ ۳۶۔

الغرض واقدی کا یہی مورخانہ اسلوب جو مورخین اور تاریخ کے طلباء کے لیے پسندیدہ ہے محدثین کے لیے نکتہ اعتراض ہے۔ امام احمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو واقدی پر کیا اعتراض ہے، آپ نے فرمایا ”انما انکر علیہ جمعہ الاسانید و مجیئہ بالمتن واحداً“ میں ان کی جس چیز کو ناپسند کرتا ہوں وہ تمام سندوں کو ایک جگہ جمع کرنا اور پھر ان کو ایک متن میں بیان کرنا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محدث ابراہیم الحربی نے کہا ہے کہ ایسا کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ اسلوب اپنایا ہے ۳۷۔ ابن اسحاق کی طرح واقدی کے بارے میں بھی بہت سے محدثین نے یہ تامل ظاہر کیا ہے کہ وہ تمام روایات کو جمع کر کے ان کو ایک مرتب بیانیہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور محدثین کے لیے اس بات کا تعین دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پورے بیانیہ میں کون سی بات کس راوی نے بیان کی ہے۔ یوں بیانیہ کے مختلف اجزاء کا الگ الگ معیار استناد مقرر کرنا ممکن نہیں رہتا۔

بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقدی کا اسلوب محدثانہ نہیں بلکہ مورخانہ ہے، کیونکہ حدیث اور تاریخ میں بہر حال فرق ہے، ابن اسحاق، واقدی اور انہی جیسے مورخین کے اسی طرز ادا اور اسلوب کی وجہ سے تیسری صدی ہجری تک آتے آتے تاریخ اور

حدیث کے راستے جدا ہو گئے، دونوں علوم نے اپنی الگ الگ شناخت پائی اور دونوں فن کے طور پر الگ الگ پہچانے گئے۔

واقدی کا انداز خالص مورخانہ ہے انہوں نے ایک منطقی اور مرتب انداز میں تاریخی تفصیلات کو بیان کیا ہے، پہلے وہ ماخذ اور حوالہ جات بیان کرتے ہیں یہ طریقہ آج بھی مروج ہے۔ تاریخ کی بڑی اور اہم کتابوں میں مصنف کتاب کے مقدمہ میں یہ ضرور بتاتا ہے کہ اپنی کتاب میں جس موضوع پر لکھ رہا ہے اس کا مواد کن کتابوں سے لیا ہے یا اس موضوع پر اس سے قبل کن ماہرین اور علماء نے لکھا ہے اسے آج تحقیق کاری Research Methodology کی زبان میں (Litrature Review) کہتے ہیں۔

بہر حال واقدی پہلے اپنے ماخذ اور حوالہ جات بیان کرنے کے بعد مربوط انداز میں زیر بحث واقعہ بیان کرتے ہیں، اس کا محل وقوع بیان کرتے ہیں بعض اہم اطلاعات شروع میں دے دیتے ہیں مثلاً جنگ میں کس کس دستے کا سربراہ کون کون تھا یا رسول اللہ اگر خود غزوہ پر تشریف لے جا رہے ہیں تو ان کی عدم موجودگی میں مدینہ میں ان کا جانشین کون تھا؟ مسلمانوں کا ”شعار“ کیا تھا؟ فوج کس تاریخ کو روانہ ہوئی اور کب واپس آئی وغیرہ۔ ان اہم اطلاعات کے بعد وہ واقعات کی جزئیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تفصیلاً ایک ایک غزوہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً غزوہ بدر کا بیان واقدی کی کتاب کے ۱۵۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس غزوہ کا اس سے زیادہ مفصل بیان سیرت کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ واقدی کے اسلوب کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے قرآن بطور ماخذ تاریخ، سیرت اختیار کیا ہے، ہر غزوہ یا بڑے واقعات جن کے بارے میں قرآن کچھ معلومات یا احکامات فراہم کرتا ہے۔ واقدی واقعہ کے تسلسل میں اس کا بھی بیان کرتے ہیں مثلاً غزوہ بدر کے بیان میں سورۃ انفال کی آیات سے مدد لی ہے، ان

آیات کی تشریح کی ہے اور جہاں کوئی سوال اٹھتا ہے اس کا عالمانہ جواب بھی فراہم کیا ہے۔ تاہم اس حوالہ سے یہ فیصلہ کرنا کہ یہ رجحان واقدی کے زمانے سے چلا آرہا ہے، درست نہیں۔ یہ فیصلہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے محاضرات سیرت صفحہ ۲۷۰ پر کیا ہے، بلکہ یہ رجحان عروہ بن زبیر کے زمانے سے چلا آرہا ہے اور دونوں کے زمانوں میں تقریباً ایک صدی کا فصل ہے۔

واقدی کی سیر و مغازی میں فنی مہارت اور علمیت کا اندازہ ایک روایت کے بارے میں ان کے نقد سے ہوتا ہے۔ محمد بن عبداللہ انصاری کی روایت میں ہے کہ حارث بن ہشام، عکرمہ بن ابی جہل، اور عیاش بن ابی ربیعہ جنگ یرموک میں زخمی ہو کر قریب قریب پڑے تھے، اسی حال میں حارث بن ہشام نے پانی طلب کیا، جب پانی لایا گیا تو عکرمہ بن ابی جہل نے حارث کی طرف دیکھا، تو انہوں نے کہا پہلے عکرمہ کو پانی پلاؤ، جب عکرمہ کے پاس پانی لے کر گئے تو انہوں نے عیاش بن ابی ربیعہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ پہلے عیاش کو پانی دو۔ پانی پلانے والا اسی حالت میں کسی کے پاس نہ پہنچ سکا اور تینوں حضرات جاں بحق ہو گئے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ واقدی سے بیان کیا تو انہوں نے اس کا شدت سے انکار کیا اور کہا کہ تمام علمائے سیر اس پر متفق ہیں کہ عکرمہ بن ابی جہل حضرت ابو بکر صدیق کے عہد خلافت میں جنگ اجنادین میں شہید ہوئے، اور عیاش بن ابی ربیعہ کا انتقال مکہ میں ہوا، اور حارث بن ہشام، ملک شام میں ۱۸ھ کے طاعون عمواس میں فوت ہوئے۔ ۳۷

محدثین حضرات نے واقدی پر تنقید ضرور کی ہے مگر بعض حالات میں انہوں نے بھی واقدی سے فیض اٹھایا ہے، یہ واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک مرتبہ امام مالک کے حلقہ درس میں یہ سوال اٹھا کہ اگر کوئی جادو کے ذریعہ کسی کو قتل کر دے تو جادو کرنے والے کو کیا سزا ملنی چاہیے؟ امام مالک نے جواباً کہا کہ اچھا میں اہل علم سے

مشورہ کر کے بتاوں گا، امام مالک نے واقدی کو خط لکھا، واقدی نے اس کا تفصیلی جواب دیا، امام مالک نے اپنے حلقہ درس میں آکر اپنے شاگردوں سے کہا میں نے اہل علم سے سوال کیا تھا، ایک عالم نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ پر جس یہودی عورت نے جادو کرنے کی کوشش کی تھی، رسول اللہ نے اسے سزائے موت دی تھی، لہذا اگر ایک جادوگر یا جادوگرنی، جادو کے ذریعہ کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے۔ ۳۸۔

واقدی کی کتاب المغازی ہر دور میں علماء اور محدثین کے نزدیک معتبر و مستند رہی ہے اور انہوں نے کتب حدیث کی طرح اس کی سماعت و روایت کی ہے ۳۹۔ اسی سماعت و روایت و نقل کی وجہ سے واقدی کی کتاب المغازی ہر دور میں متداول رہی، یہ کتاب مخطوطات کی شکل میں طویل عرصہ تک دستیاب رہی اور تقریباً ہر دور کے سیرت نگاروں نے ان مخطوطات سے استفادہ کیا۔ اس کتاب کے قلمی نسخے بہت سے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اس کی اشاعت کی نوبت انیسویں صدی کے وسط میں آئی۔ پہلی بار اس کتاب کے بعض اجزاء فان کریر نے ایشیا ٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۶ء میں شائع کرائے۔ جے۔ ولہاوزن (J. Wellhausane) نے ان اجزاء کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ دوسری بار ۱۹۳۶ء میں مصر سے معمولی کاغذ و طباعت کے ساتھ عباس شربینی نے شائع کرائی اور تیسری بار ۱۹۶۶ء میں اس کا شاندار ایڈیشن تین ضخیم جلدوں میں ڈاکٹر مارسڈن جونز کی تعلق و تحقیق کے ساتھ لندن سے شائع ہوا۔ ۴۰۔

کتاب المغازی کا فارسی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا اختصار بھی کیا تھا، ان کا خودنوشت نسخہ دارالکتب قاہرہ میں محفوظ ہے ابوالحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اس کے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ۴۱۔

واقدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے سیرت و مغازی کے ساتھ

ساتھ علم السیر (International Law) کو بھی اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ہے۔ گویا واقدی کی کتاب المغازی میں غزوات کے ساتھ ساتھ علم السیر کی تفصیل بھی ہوتی تھیں مثلاً عہد نبوی میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدات کا پس منظر کیا تھا؟ ثالثی اور جنگ بندی کے طریقے کیا تھے؟ رسول اللہ نے حربی اور عسکری امور کے لیے سراغ رسانی کا جو شعبہ قائم کیا تھا وہ کیسے کام کرتا تھا؟ یہ ساری تفصیلات واقدی کی کتاب المغازی میں ملتی ہیں۔

واقدی صرف سیرت نگار یا مورخ ہی نہ تھے بلکہ فقیہ اور قاضی بھی تھے، لہذا ان کی نظر سیرت کے اس پہلو پر خصوصیت کے ساتھ تھی جس کا تعلق صلح و جنگ کے معاملات اور بین الاقوامی تعلقات سے تھا، اس حوالے سے واقدی کے کام کو امام شافعی نے اپنی ”کتاب الام“ میں محفوظ کیا ہے۔ امام شافعی کی کتاب ”الام“ جو فقہ شافعی کی اساس اور بنیاد مانی جاتی ہے اور آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی چوتھی جلد میں ”سیرالواقذی“ کے نام سے ایک کتاب بیان کی ہے جو واقدی کی سیر کا وہ حصہ ہے جس پر امام شافعی نے کوئی تبصرہ کرنا چاہا۔ ۴۲

## آثار علمیہ:

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ابن الندیم اور یاقوت حموی نے ان کی کتابوں کی تعداد ۲۸ بتائی ہے۔ ان ۲۸ کتابوں کو موضوعاتی ترتیب سے لکھا جا رہا ہے۔

### (الف) علوم القرآن:

۱. کتاب ذکر القرآن

۲. کتاب الرغیب فی علم القرآن و غلط الرجال

### (ب) علوم الحدیث

۳. کتاب غلط الحدیث

۴. کتاب السنة والجماعة و ذم الهوى و ترک الخوارج فى الفتن (ایک نسخہ میں ترک الخروج ہے)
- (ج) علم السیرة:
۵. کتاب السیرة
۶. کتاب التاريخ و المغازی و المبعث (اس پر تفصیلی بحث اوراق گذشتہ میں آچکی ہے)
۷. کتاب ازواج النبیؐ (طبقات ابن سعد میں اس کے بہت سے حوالے ملتے ہیں)
۸. کتاب وفاة النبیؐ
- (د) علوم الفقہ:
۹. کتاب الاختلاف
۱۰. کتاب المناکح
- (ه) علم التاريخ:
۱۱. کتاب التاريخ الكبير
۱۲. کتاب تاریخ الفقہاء
۱۳. کتاب الطبقات (یہ کتاب، محمد ابن سعد کی 'الطبقات الکبریٰ' کی بنیاد اور اساس بنی)
۱۴. کتاب اخبار مکہ (امام ازرقی نے اپنی کتاب 'اخبار مکہ' میں اس سے اخذ و استفادہ کیا ہے)
۱۵. کتاب فتوح الشام (یہ کتاب مصر سے کئی بار شائع ہو چکی ہے)
۱۶. کتاب فتوح العراق
۱۷. کتاب سیرة ابی بکر و وفاته
۱۸. کتاب السقیفہ و بیعت ابی بکر
۱۹. کتاب امر الحبشہ و الفیل
۲۰. کتاب حرب الاوس و الخزرج
۲۱. کتاب الجمل



۲۲. کتب الصفین (ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اس کے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں)

۲۳. کتاب مولد الحسن والحسین ومقتل حسین

۲۴. کتاب مقتل الحسن

۲۵. کتاب مداعی قریش والا نصار فی القطنع ووضع عمر الدواوین وتصنیف

القباہل ومراتبها وانسابها

۲۶. کتاب ضرب الدنانیر والدرہم

۲۷. کتاب الردہ والدار ۲۳

### اخلاقیات:

۲۸. کتاب الآداب

ان ۲۸ کتابوں کے علاوہ نوادینر گین چند اور کتابوں کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں مثلاً

(۱) سیرت النبی کے حوالے سے ان کا ایک رسالہ ”مولد النبی“ تھا جس کے تمس اور اق کتب خانہ الظاہریہ، دمشق میں ہیں۔

(۲) اسی طرح واقدی کی ایک کتاب ”فتوح مصر“ تھی جس کے قلمی نسخے مصر اور استنبول میں موجود ہیں۔

(۳) فتوح البہنسانی صعید مصر، یہ قاہرہ میں چھپ چکی ہے، فرانسیسی میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۴) طعم النبی: اس کے اقتباسات ابن سعد نے دیئے ہیں۔

(۵) التفسیر: الثعالبی نے اپنی تفسیر الکشف والبیان میں اس سے استفادہ کیا ہے

اسی طرح سے فتوح افریقیہ اور فتوح آمد بھی واقدی کی طرف منسوب ہیں ۲۴

واقدی کا ایک اور رسالہ یا کتاب جس کی طرف فہرست سازی کرنے والوں

کی توجہ نہیں گئی وہ علم السیر پر ان کا رسالہ یا کتاب ہے جو امام شافعی کی ”کتاب الام“ کی چوتھی جلد میں شامل ہے اور جس پر امام شافعی نے نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو امام واقدی کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ۳۶ کے قریب پہنچ جاتی ہے، اسی لیے ان کو بجا طور پر ”صاحب تصانیف کثیرہ“ کہا گیا ہے۔

الغرض واقدی کو ابن اسحاق کے مقابلے میں زیادہ پذیرائی ملی، مشرق سے زیادہ ان پر مغرب میں کام ہوا ہے۔ واقدی کی کتاب المغازی کو سب سے پہلے زیور طباعت سے آراستہ کرنے والے فان کریر تھے، یہ درست ہے کہ جس مخطوطہ سے انہوں نے ایڈیشن تیار کیا وہ دمشق سے حاصل کردہ نامکمل اور ناقص نسخہ تھا۔ جو انہوں نے ۱۸۸۶ء میں کلکتہ سے شائع کرایا۔ جرمن مستشرق (J. Wellhausen) نے کتاب المغازی کی تلخیص کر کے اس کا جرمن میں ترجمہ کیا اور ۱۸۸۲ء میں برلن سے شائع کرایا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے برٹش میوزیم میں محفوظ نسخہ سے مدد لی جو مکمل، صحیح اور زیادہ خوش خط نسخہ تھا۔ ۱۹۶۳ء میں اس سلسلہ کا شاندار کام جونز مارسیڈن (J.M.B. Jones) نے کیا، انہوں نے برٹش میوزیم والے نسخہ کو بڑی محنت سے ایڈٹ کیا اور ان کی تحقیق و تعلق کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے تین ضخیم جلدوں میں ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب بارہ سو صفحات پر مبنی ہے۔ ۴۵

مسلمان علماء نے ایک عرصہ تک واقدی کے علمی مرتبہ کا اعتراف نہیں کیا۔ عصر جدید کے ہندوستانی عالم علامہ شبلی نعمانی واقدی کو اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اپنی ”سیرت النبی“ کے مقدمہ میں، جہاں انہوں نے سیرت نگاران نبوی کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کا نام بھی لیں۔ وہ واقدی کو ناقابل اعتبار اور ناقابل ذکر گردان کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ۴۶ لیکن رفتہ رفتہ واقدی کی علمی فتوحات سامنے آرہی ہیں اور انہیں ان کا مقام، جس کے وہ حقدار تھے، ملنے لگا ہے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب پنجم، فصل دوم)

- ۱۔ ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۲۶، ابن الندیم 'الفہرست'، ص ۱۲۷۔
- ۲۔ ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۲۶۔
- ۳۔ الفہرست، ص ۱۲۸ (یہ وہ جگہ ہے جہاں مہدی کی بیوی خیزران مدفون ہے)۔
- ۴۔ ذہبی 'سیر اعلام النبلاء' جلد ۹، ص ۳۶۷ (موسسة الرسالة، بیروت، ۱۴۰۶ھ)۔
- ۵۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۳، ص ۳ (قاہرہ، ۱۹۳۱ء)۔
- ۶۔ اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۲۱۹۔
- ۷۔ ایضاً، ص ۲۲۱۔
- ۸۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۳، ص ۶۔
- ۹۔ یہ واقعہ بہت تفصیل سے طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۴۲۵ پر بیان کیا گیا ہے۔
- ۱۰۔ اس سفر کی تفصیلی روئداد کے لیے دیکھئے طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۴۲۶ تا ۴۳۳ (دارصادر، بیروت، ۱۹۸۵ء)۔
- ۱۱۔ تاریخ بغداد جلد ۳، ص ۲۰۔
- ۱۲۔ الفہرست، ص ۱۷۲۔
- ۱۳۔ جوزف ہورودتس، ص ۷۸۲۔
- ۱۴۔ ثار احمد فاروقی حاشیہ ۴۵۵ بر کتاب جوزف ہورودتس، ص ۸۱۵۔
- ۱۵۔ جوزف ہورودتس، ص ۷۸۳۔
- ۱۶۔ ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۵، ص ۴۲۵۔
- ۱۷۔ ابن خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۳، ص ۳۔
- ۱۸۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان۔
- ۱۹۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۹، ص ۴۵۴۔

- ۲۰۔ الفہرست، ص ۱۲۲۔
- ۲۱۔ قاضی اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۲۲۱۔
- ۲۲۔ ایضاً۔
- ۲۳۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی 'طبقات ابن سعد' مشمولہ نقوش رسول نمبر جلد ۱، ص ۵۰۱۔
- ۲۴۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۳، ص ۹۔
- ۲۵۔ محاضرات سیرت، ص ۲۶۳۔
- ۲۶۔ نثار احمد فاروقی، ص ۵۰۱۔
- ۲۷۔ ایضاً۔
- ۲۸۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ۔
- ۲۹۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی 'طبقات ابن سعد سیرت نبوی کا قدیم ماخذ' مشمولہ نقوش جلد ۱، ص ۵۰۰ رسول نمبر۔
- ۳۰۔ محمود، خالد انور، اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۱۲۱۔
- ۳۱۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۲۶۷۔
- ۳۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۲۶۔
- ۳۳۔ دیکھئے 'الفہرست'، ص ۱۲۸، یا قوت جموی 'معجم الادباء' جلد ۷، ص ۵۸۔
- ۳۴۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۴۔
- ۳۵۔ جوزف ہورودتس 'سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین'، ص ۷۸۱۔
- ۳۶۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۳، ص ۷۔
- ۳۷۔ محاضرات سیرت، ص ۲۷۵۔
- ۳۸۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۲۳۔
- ۳۸۔ محاضرات سیرت، ص ۲۷۵۔

۳۹۔ واقدی کی کتاب المغازی روایت کرنے والوں کی تفصیل کے لیے دیکھئے۔ اطہر

مبارک پوری کی کتاب 'تدوین سیر و مغازی، ص ۲۲۵۔

۴۰۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۶۔

۴۱۔ ایضاً۔

۴۲۔ محاضرات سیرت، ص ۲۶۱۔

۴۳۔ اس کتاب کے طویل اقتباسات ابن حُبیش (م ۵۸۴ھ) کی ہنوز غیر مطبوعہ "کتاب

غزوات" میں پائے جاتے ہیں جس سے کیتانی (L. CAETANI) نے اپنی کتاب

"حولیات اسلام" کی فصل "ردہ" میں فائدہ اٹھایا ہے۔ واقدی کی یہ کتاب اسپین میں بھی

معروف رہی ہے چنانچہ ابو خیر (م ۵۷۵ء) اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتا ہے اور اسے

"کتاب الردہ" کہتا ہے (سیرت نبوی کی اولین کتابیں، اور ان کے مولفین، تحریر جوزف

ہور ووتس، ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مشمولہ 'نقوش' رسول نمبر جلد ۱، ص ۷۷۹، ادارہ فروغ

اردو، لاہور دسمبر ۱۹۸۲ء) فواد سیزگین کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی علمی مساعی

سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۴۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۶۔

۴۵۔ دیکھئے واقدی کی 'کتاب المغازی' مرتب جے۔ ایم۔ بی جونز، ۳ جلدیں، آکسفورڈ

یونیورسٹی پریس ۱۹۶۴ء۔

۴۶۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی (مقدمہ) ص ۲۵ نیز ۳۳۔

## محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ/۸۴۰ء)

متقدمین سیرت نگاروں میں محمد ابن سعد، جو کاتب الواقدی کے نام سے مشہور ہیں، اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے سیرت نگاری کے علاوہ طبقات کے فن کو آگے بڑھایا، یہ درست ہے کہ اس میں اولین کتاب ان کے استاد واقدی کی تھی لیکن اسی سلسلہ کو انہوں نے زیادہ مربوط اور منظم کیا اور اپنے استاد سے زیادہ ثقہ اور معتبر مانے گئے، باوجود اس کے کہ تصانیف کی تعداد کے اعتبار سے ان کا واقدی سے کوئی مقابلہ نہیں۔

### حالات زندگی:

ابو عبد اللہ محمد بن سعد بن منیع البصری، جو ”کاتب الواقدی“ کے نام سے مشہور ہوئے موالی بنی ہاشم میں سے تھے۔ ۱۶۸ھ/۷۸۴ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ زندگی مدینہ منورہ اور دوسرے شہروں میں گزری۔ علم فقہ، حدیث، سیرت و مغازی کی تحصیل کے سلسلہ میں وہ ۱۸۹ھ کے قریب مدینہ میں تھے، حصول علم کی غرض سے کوفہ، دمشق اور بغداد بھی گئے۔ ابن سعد نے اپنے عہد کے مشہور محدثین سے علم الحدیث حاصل کیا ان میں وکیع بن الجراح، سلیمان بن حرب، ہشیم بن بشیر، ابو نعیم فضل بن ذکین، سفیان بن عیینہ، ولید بن مسلم، ابو ولید طیالسی، محمد بن سعدان اور بالخصوص محمد بن عمر الواقدی زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ۶۲ سال کی عمر میں ۲۳۰ھ/۸۴۰ء میں بغداد میں وفات پائی۔

آپ بلند پایہ حافظ حدیث اور مورخ تھے۔ بغداد میں آپ واقدی کے کاتب

رہے اور اسی نسبت سے ”کاتب الواقدی“ کہلائے۔ واقدی کو کتابوں کے حصول کا بڑا شوق تھا، ان کا اپنا شاندار کتب خانہ تھا، وہ ہر اچھی کتاب کو نقل کرا کے اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے، کتابیں نقل کرنے پر دو افراد مامور تھے۔ ہو سکتا ہے ابن سعد انہی میں سے ایک ہوں۔ ابن خلکان یہ اطلاع دیتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف صرف چار آدمیوں کی تحویل میں تھیں اور ان چاروں میں، محمد ابن سعد کا نام سر فہرست ہے۔

ابن سعد سیرت نگار اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے۔ ایک مرتبہ مامون الرشید نے کسی اہم معاملہ میں مشاورت کے لیے سات بڑے فقہا کو بلایا تھا، ان میں ابن سعد بھی شامل تھے۔ وہ قرأت میں بھی درک رکھتے تھے، علم انساب سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ جو اس دور میں تاریخ نگاری کے لیے بہت اہم علم سمجھا جاتا تھا۔

## آپ کے بارے میں علماء کی رائے:

واقدی کے برعکس تقریباً تمام علماء نے آپ کو ثقہ اور معتبر مانا ہے۔ امام ابو عبد اللہ محمد الذہبی، صاحب ”تذکرہ الحفاظ“ آپ کو ”علم کا سمندر“ کہتے ہیں۔ ابن الندیم آپ کے بارے میں کہتا ہے ”یہ ثقہ اور پارسا تھے، اخبار صحابہ اور تابعین کے عالم تھے۔“

یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ محمد بن سعد ہمارے نزدیک عادل ہیں۔ ان کی حدیث ان کی صداقت کی دلیل ہے۔ وہ اپنی بہت سی روایات میں تحقیق و تخری سے کام لیتے ہیں، تحقیق و عدالت و صداقت کی وجہ سے ان کو ثقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

متاخر دور کے دو بڑے محدثین خطیب بغدادی اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں ابن سعد کو ثقہ مانتے ہیں خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ اہل علم و فضل میں سے ہیں انہوں نے صحابہ، تابعین اور اپنے زمانے تک کے طبقات میں بہت بڑی کتاب تصنیف کی ہے۔“ دوسری جگہ لکھتے ہیں ”ابن سعد کثیر العلم، کثیر الحدیث، کثیر الروایۃ، کثیر

الطلب، اور کثیر الکتب عالم تھے، انہوں نے غریب الحدیث اور فقہ میں کتابیں لکھی ہیں۔“ ۶  
امام سخاوی جو متاخر دور کے بڑے مورخین اور محدثین میں سے ہیں انہوں نے  
بھی ابن سعد کی ثقاہت کی تعریف و تصدیق کی ہے۔

### ابن سعد بطور سیرت نگار:-

ابن سعد کی تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔

۱۔ طبقات الکبریٰ۔

۲۔ طبقات الصغریٰ یا الطبقات الصغیر۔

۳۔ اخبار النبی۔

۴۔ غرائب الحدیث والفقہ۔

۵۔ قصیدہ حلوانیہ۔

ابن الندیم ان کی صرف ایک کتاب ”اخبار النبی“ کا تذکرہ کرتا ہے بے دراصل  
یہ ’طبقات الکبریٰ‘ کا ابتدائی حصہ ہے۔

اس حوالے سے جوزف ہو رووٹس یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اخبار النبی اور  
طبقات، ابن سعد کی دو علیحدہ تصانیف تھیں جنہیں ۳۰۰ھ کے لگ بھگ ابن معروف نے  
یکجا کر دیا اور ”اخبار النبی“ کو طبقات کا پہلا جز بنا دیا ۸۔

طبقات الکبریٰ کی ابتدائی دو جلدیں، سیرت پر ہیں۔ اور ابن اسحاق کی سیرة  
کے بعد یہ دوسری سیرة کی کتاب ہے جو ہم تک مکمل شکل میں پہنچی ہے، اس میں انہوں  
نے رسول اللہ سے قبل کی تاریخ رسالت بھی بیان کی ہے۔ اور رسول اللہ کے بعد ان کے  
صحابہ اور تابعین کے حالات و کوائف بیان کر کے ابتدائی دو سالوں کی گویا تاریخ مرتب  
کردی ہے۔

ابن سعد نے ما قبل بعثت نبوی کی تاریخ میں ان انبیاء کرام کے حالات بیان



کئے ہیں جن کا آپ کی رسالت سے رشتہ ہے گویا ابن سعد بالواسطہ طور پر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تمام انبیاء کی نبوت، رسول اللہ کی نبوت کی تمہیدی تھی، تمہیدی نبوتوں کے بیان سے ختم نبوت کی عظمت اور حقیقت مکمل طور پر سامنے آسکتی ہے اس لیے ابن سعد نے تمام انبیاء کی نبوت کا بیان ضروری سمجھا۔ اس حوالے سے وہ واقدی کے برخلاف ابن اسحاق کے نقش قدم پر چلے ہیں، پھر آپ کے آبا و اجداد کے ذکر کے بعد آپ کے بچپن کے حالات، بعثت سے قبل و مابعد آپ کی علامات نبوت اور آپ کی دعوت و تبلیغ کے حالات ہجرت مدینہ تک بیان کیے ہیں۔ پھر مدنی عہد میں آپ کے احکامات، عرب و فود کی آمد، آپ کے اخلاق، طریقہ زندگی غزوات، وفات، تجہیز و تکفین و تدفین، میراث وغیرہ کے متعلق معلومات مرتب کرنے کے بعد وہ مراثنی جمع کر دیئے ہیں جو آپ کی وفات پر مختلف لوگوں نے کہے۔

ابن سعد نے رسول اللہ کے شمائل، فضائل اور دلائل نبوت پر بھی وسیع معلومات فراہم کیں۔ آگے چل کر علماء نے شمائل اور دلائل النبوة پر باقاعدہ کتب تصنیف کیں اس حوالے سے جوزف ہوروتس کا بیان ہے ”وہ (ابن سعد) غالباً پہلا مولف بھی ہے جس نے ”علامات النبوة“ کو یک جا کیا ہے اس سے زمانہ مابعد میں ”دلائل النبوة“ جیسی کتابوں کی تالیف کی گئی، اسی طرح اس نے اپنی کتاب کی فصل ”صفة اخلاق رسول اللہ“ لکھ کر شمائل کے موضوع پر تصانیف کا راستہ ہموار کر دیا۔“

شمائل سے مراد رسول اللہ کا حلیہ مبارک، عادات و خصائل، اور معمولات زندگی کا بیان ہے۔ یوں تو احادیث میں بھی شمائل نبوی کا تذکرہ ہوتا ہے، صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں بھی شمائل کا علیحدہ باب موجود ہے لیکن تیسری صدی ہجری کے ربع آخر سے ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جو صرف شمائل نبوی کے موضوع پر تھیں۔ مشہور محدث امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی کتاب الشمائل اس فن کی سب سے پہلی اور مشہور تالیف ہے۔ اس

کے بعد کئی کتب شامل لکھی گئیں۔

اسی طرح ابن سعد نے اپنی طبقات الکبریٰ میں دلائل النبوة پر اہم معلومات و مباحث بیان کیے جس کی بنیاد پر آگے چل کر کتب دلائل لکھی گئیں۔ جن میں رسول اللہ کے معجزات اور روحانی کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ لہذا ابن سعد کے انتقال کے ربع صدی بعد ہی دو ایسی اہم کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ابو اسحاق حربی (م ۲۵۵ھ) اور دوسرے ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) دونوں کی کتاب کا نام ”دلائل النبوة“ ہے اور اس فن اور موضوع پر یہ اولین کتابیں ہیں، اس کے بعد لگاتار اس موضوع پر لکھا جاتا رہا۔

گویا ابن سعد نے طبقات الکبریٰ کے جز اخبار النبی میں رسول اللہ کے شامل و فضائل اور دلائل نبوة کے بارے میں جو وسیع معلومات فراہم کیں ان کی بنیاد پر آنے والی صدیوں میں متعدد کتب شامل اور کتب دلائل نبوة تالیف ہوئیں۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ابن سعد نے بعض بعض موقعوں پر ابن اسحاق سے زیادہ تفصیلات دی ہیں مثلاً ان فصلوں میں جو رسول اللہ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں یا آپ کے رسائل و سفارات سے بحث کرتی ہیں خصوصاً وہ حصے جو مرض اور وفات کے بارے میں ہیں۔ ۹۔ اسی طرح بعض جگہ ابن سعد سرسری گذر جاتے ہیں جبکہ انہی موقعوں پر ابن اسحاق نے مفصل بحث کی ہے، مثلاً اسلام سے پہلے عربوں کی وہ تاریخ جس کا رسول اللہ کے اجداد سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ۱۰۔

جہاں تک ابن سعد کے ماخذ کا تعلق ہے، رسول اللہ کی رسالت سے قبل کی تاریخ، یا ایام جاہلیت کی تاریخ کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا راوی ہشام بن محمد بن سائب کلبی (م ۲۰۶ھ) ہے۔ جو محمد ابن سائب کلبی ۱۱ کے بیٹے تھے اپنے والد کی طرح انساب اور ایام جاہلیت کے عالم تھے۔ ابن سعد ان کی علمیت کے قائل تھے ۱۲ لیکن وہ

طبقات الکبریٰ میں اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ بعض محدثین کے نزدیک ہشام ابن محمد کلبی ضعیف تھے۔ ۱۳۔

یقیناً پھر ایام جاہلیت کی تاریخ میں ہشام کلبی کو اپنا ماخذ بناتے ہوئے محمد ابن سعد کو بہت زیادہ تحقیق سے کام لینا پڑا ہوگا تاکہ ان کا کام علماء کے نزدیک مسترد نہ ہو۔ ہشام کی علمیت کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابن الندیم نے ان کی ۱۳۳ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ۱۹ کتابیں انساب العرب پر ہیں۔ ۱۰ کتابیں شہروں کے حالات میں ہیں، گذشتہ لوگوں کے حالات میں ۳۵ کتب، عرب کے ایام جاہلیت کے حوالے سے ۲۳ کتب اور دیگر کتب اسلامی تاریخ پر ہیں۔ ۱۴۔

ابن اسحاق نے تاریخ رسالت بیان کرتے ہوئے، یا حضرت آدم سے رسول اللہ تک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اسرائیلیات کو اپنا ماخذ بنایا تھا جس پر انہیں ہدف تنقید بنایا گیا، لیکن ابن سعد کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوا کیونکہ انہوں نے وہی روایات لیں جن کی ثقاہت کے بارے میں انہوں نے تحقیق کر لی۔ اسرائیلیات کے بارے میں علماء کی رائے یہ ہے کہ اسرائیلیات کا وہ حصہ جو قرآن اور حدیث رسول کے مطابق ہو وہ قابل قبول ہے۔ اور جو قرآن و سنت کے بیانات کے مطابق نہیں وہ ناقابل قبول ہے، ظاہر ہے کہ ابن سعد نے کوئی ایسی چیز نہیں لی جو صراحتاً قرآن و سنت سے متعارض ہو، البتہ ایسی کوئی چیز جس کے بارے میں قرآن سنت میں نہ کوئی منفی بات ملے نہ مثبت تو ایسی باتوں کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ ان کو قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے، کچھ لوگوں نے اس کو قبول کرنے اور بیان کرنے میں حرج نہیں سمجھا، اور کچھ لوگوں نے اس کو بیان کرنے میں حرج سمجھا ہے ابن سعد اول الذکر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور ایسے مواد کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ ۱۵۔

جہاں تک مدنی دور کی تاریخ کا معاملہ ہے تو ابن سعد کا سب سے بڑا ماخذ

واقدی ہی ہے تاہم اس کے علاوہ جن شیوخ سے اس نے بلاواسطہ یا بالواسطہ روایات لی ہیں ان کے نام ابتداء ہی میں بیان کر دیئے ہیں ان میں محمد بن عمر سلمی واقدی کے علاوہ عمر بن عثمان بن عبدالرحمن مخزومی، موسیٰ بن محمد بن ابراہیم تیمی، محمد بن عبداللہ بن مسلم بن انخی زہری، موسیٰ بن یعقوب بن عبداللہ، عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمن زہری، یحییٰ بن عبداللہ بن ابوقنادہ انصاری، ربیعہ بن عثمان بن عبداللہ تیمی، ابراہیم بن اسماعیل بن ابو حبیبہ اشہلی، عبدالحمید بن جعفر حکمی، عبدالرحمن بن ابوالزناد، محمد بن صالح تمار سے ابن سعد نے براہ راست روایت کی ہے۔ ان کے علاوہ محمد ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر سندی سے اپنے سلسلہ سند سے روایت کی ہے۔ ابن اسحاق کی روایات زعم بن یزید سے، ابو معشر کی روایات حسین بن محمد سے اور موسیٰ بن عقبہ کی روایات، اسماعیل بن عبداللہ سے بالواسطہ اخذ کی ہیں ۱۶۔ اور اپنے استاد واقدی کی طرح ان سب کی روایات کو یکجا کر کے کتاب المغازی مرتب کی ہے جو طبقات الکبریٰ میں شامل ہے۔ ۱۷

غزوات کے بیان میں ابن سعد، ہر غزوہ کی تفصیلی روایت اپنا ماخذ بتائے بغیر درج کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے ابتداء ہی میں سب راویوں کے نام اکٹھے لکھ دیئے ہیں، ہر غزوہ کے ایک بڑے بیانیہ کے بعد وہ انفرادی روایات دیتے ہیں جن کے ساتھ سند بھی بیان کرتے ہیں۔ جوزف ہورووٹس کہتے ہیں کہ اس اعتبار سے مغازی کے بیان میں ابن سعد کو واقدی سے ایسی ہی نسبت ہے جیسی واقدی کو ابن اسحاق سے ہے، مگر واقدی سرے سے ابن اسحاق کا نام ہی نہیں لیتے جبکہ ابن سعد کبھی یہ حقیقت نہیں چھپاتے کہ ان کا اہم ماخذ واقدی ہے۔ ۱۸

ایک خصوصیت میں ابن سعد نے واقدی کے انداز کو پوری طرح نبھایا ہے یعنی وہ یہ ضرور بتاتے ہیں کہ رسول اللہ کی مدینے سے غیر حاضری کے زمانے میں وہاں کون حاکم رہا تھا؟۔ ابن سعد نے رسول اللہ کے مرض الموت اور پھر وفات سے متعلق معلومات

فراہم کرنے میں غیر معمولی محنت کی ہے، انہوں نے واقدی کی کتاب ”وفاة النبی“ سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی بہت اہم اضافے کئے ہیں۔ ۱۱۹ ابن سعد نے رسول اللہ کے فرامین، احکام اور وثائق کا ایک بڑا مجموعہ اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، یہ مواد دراصل ان کے استاد واقدی نے جمع کیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ میں نے یہ فرامین اپنے استاد واقدی سے لیے ہیں۔ واضح رہے کہ واقدی نے انہی اصل فرامین اور دستاویزات کی نقل کروائی جو انہوں نے خود دیکھے تھے۔ ۲۰

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ’طبقات الکبریٰ‘ کی ابتدائی دو جلدیں سیرة رسول اللہ پر ہیں باقی چھ جلدیں صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے تذکرے پر مشتمل ہیں جن کو ابن سعد نے زمانی اور مکانی ترتیب سے طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ صحابہ و تابعین کا تذکرہ شروع کریں، انہوں نے ان تمام شیوخ کے نام بتائے ہیں جن سے انہوں نے بالا واسطہ یا بالواسطہ روایات اخذ کر کے طبقات کا مواد اکٹھا کیا ہے۔ ۲۱

”طبقات“ کو سیرة النبی کا اہم تکرار سمجھنا چاہیے اس میں اصحاب رسول کا تذکرہ ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ کے ساتھ زندگی گزاری اور اہم معاملات میں حصہ لیا اور جنہوں نے آپ کے اعمال و اقوال کی روایت کی، اس کے بعد ان تابعین کا ذکر ہے جنہوں نے رسول اللہ کو تو نہیں دیکھا لیکن ان کے اصحاب کا شرف صحبت حاصل کیا، اس کے بعد ان تابعین کی صحبت سے سرفراز ہونے والے تبع تابعین کا تذکرہ ہے یوں ابن سعد کے طبقات میں ۲۳۰ھ تک کے تبع تابعین کا مکمل تذکرہ مل جاتا ہے۔

یہ کتاب حارث بن محمد بن اسامہ التمیمی (م ۲۸۲ھ / ۸۹۳ء) کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے ۲۲۔ طبقات کی مختلف جلدیں برلن، استنبول اور لندن کے کتب خانوں میں تھیں، جرمن مستشرقین کی علمی کاوشوں سے جن میں زخاؤ، یوسف ہارویز اور براکلمان وغیرہ شامل تھے، طبقات کی آٹھ جلدیں لائڈن سے شائع ہوئیں (۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۷ء) نویں جلد

مختلف فہارس میں مشتمل ہے۔ اس کے بعد طبقات کی آٹھ جلدیں بیروت سے چھپ کر شائع ہوئیں (۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۰ء) ۲۳۔ طبقات ابن سعد کا فارسی اور اردو ترجمہ ہو چکا ہے، اردو ترجمہ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کی علمی یادگار ہے۔

طبقات ابن سعد ہمیشہ سے محدثین اور علماء کے نزدیک نہایت مستند ماخذ رہی ہے۔ بعد میں اسی نبج پر ان گنت کتابیں لکھی گئیں ۲۴ وہ مورخین جنہوں نے صحابہ کرام یا اسلامی تاریخ پر کتابیں لکھیں ان سب نے ابن سعد سے استفادہ کیا ان میں بلاذری جیسے ثقہ اور قابل اعتماد مورخین بھی شامل ہیں نیز ابن اثیر نے 'اسد الغابہ' لکھتے ہوئے اور ابن حجر عسقلانی نے 'الاصابہ' لکھتے ہوئے ابن سعد سے استفادہ کیا ہے۔ ابن سعد کی دیگر تصانیف میں ایک "قصیدہ حلوانیہ فی افتخار القحطانی علی العدنانین" ہے، قاہرہ میں اس کے چند اجزاء ملتے ہیں۔ غازی بن یزید نے اس قصیدے کی شرح بھی لکھی تھی ۲۵۔

ابن سعد کی ایک اور کتاب "کتاب الطبقات الصغیر" بھی تھی اس کے ۱۳۹۔ اوراق استنبول میں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب الطبقات الکبریٰ یا طبقات الکبریٰ سے پہلے لکھی گئی تھی اس میں بعض مشاہیر کے حالات ہیں۔ ۲۶۔

حسین بن فہم (۲۱۱ھ-۲۸۹ھ) کا یہ بیان کہ "آپ (ابن سعد) بہت زیادہ علم کے حامل اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے حدیث، فقہ اور غریب روایات میں بہت سا مواد جمع کیا ہے" ۲۷ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی اور تصانیف بھی رہی ہوں گی تاہم وہ ہم تک نہیں پہنچیں۔

ابن سعد پر ہم سیرت نگاری کے دوسرے دور یا بالفاظ دیگر متقدمین کے دور کا خاتمہ کریں گے، کیونکہ اس کے بعد کی اہم تاریخی تصانیف جن میں طبری، مسعودی اور یعقوبی کے نام لیے جاسکتے ہیں سیرۃ نبوی، تاریخ عالم کے ایک حصے کے طور پر شامل رہی۔ اور سیرۃ پر علیحدہ سے کتابیں لکھنے کا رجحان تقریباً دو سو سال بعد دوباراً شروع ہوا۔

جو متاخرین کا عہد تھا اور جو ہمارے اس بحث کے دائرہ سے باہر ہے۔  
الغرض تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں اسلامی تاریخ جو سیرت النبی  
اور تذکرہ صحابہ کے گرد گھوم رہی تھی، عالمی تاریخ کا جزو بن گئی۔ مورخین نے عالمی تاریخیں  
لکھنی شروع کیں، اس صدی کے اہم اساطین تاریخ میں ابن قتیبہ الدینوری (م ۲۷۰ھ /  
۸۸۲ء)، ابو حنیفہ الدینوری (م ۲۸۲ھ / ۸۹۷ء)، بلاذری (م ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء)، یعقوبی  
(م ۲۹۲ھ / ۹۰۷ء)، طبری (م ۳۱۰ھ / ۹۲۵ء) اور مسعودی شامل ہیں ان سب اساطین  
تاریخ اسلامی کا نقطہ نظر عالمی تھا اور اسی بناء پر ان کی کتب تاریخ حضرت آدم ابوالبشر سے  
شروع ہو کر ان مورخین کے اپنے عہد پر ختم ہوتی ہیں۔ درمیان میں سیرۃ النبی تاریخ کے  
ایک درخشاں باب کے طور پر شامل ہوتی ہے یہ سلسلہ کم و بیش دو سو سال تک چلا۔ تا آنکہ  
پھر سے متقدمین کی کتب ہائے سیرت کو بنیاد بنا کر سیرت پر علیحدہ سے لکھا جانے لگا اور یہ  
دور، دور متاخرین کہلاتا ہے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب پنجم، فصل سوئم)

- ۱۔ ابن خلکان 'وفیات الاعیان' جلد ۳، ص ۲۸۳۔
- ۲۔ محاضرات سیرت، ص ۲۸۰۔
- ۳۔ ذہبی 'تذکرہ الحفاظ' جلد ۱، ص ۳۱۹ (ذہبی نے اپنے شیخ شرف الدین دمیاطی سے طبقات الکبریٰ سبقاً سبقاً پڑھی تھی)۔
- ۴۔ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۲۸۔
- ۵۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۵۰۔
- ۶۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۵، ص ۱۲۱۔
- ۷۔ الفہرست، ص ۱۲۸۔
- ۸۔ جوزف ہورووٹس 'سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین' ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔ مشمولہ نقوش (سیرت نمبر) جلد ۱، ص ۷۸۳۔
- ۹۔ جوزف ہورووٹس، ص ۷۸۳۔
- ۱۰۔ ایضاً۔
- ۱۱۔ محمد بن سائب کلبی کی کنیت ابوالنضر ہے۔ ان کے والد سائب بن بشر، حضرت علی کے ہمراہ جنگ جمل میں شریک ہوئے۔ سائب بن بشر مصعب بن زبیر کے ہمراہ قتل ہوئے۔ سائب کے بیٹے محمد جماجم کے معرکہ میں عبدالرحمن بن محمد الاشعث کے ہمراہ شریک ہوئے۔ محمد بن سائب علم تفسیر، علم انساب العرب کے عالم تھے، ان کا انتقال ۱۲۷ھ میں کوفہ میں ہوا جبکہ ابو جعفر المنصور کی خلافت کا زمانہ تھا۔ (محمد ابن سعد الطبقات الکبریٰ جلد ۶، ص ۳۵۹)۔
- ۱۲۔ محمد ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۶، ص ۳۵۹۔
- ۱۳۔ ایضاً۔



- ۱۴۔ الفہرست، ص ۱۲۳ تا ۱۲۷۔
- ۱۵۔ محاضرات سیرت، ص ۲۷۸۔
- ۱۶۔ جوزف ہورووٹس، ص ۷۸۳۔
- ۱۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'تدوین سیرومغازی'، ص ۲۵۰-۲۵۱۔
- ۱۸۔ جوزف ہورووٹس، ص ۷۸۵۔
- ۱۹۔ ایضاً۔
- ۲۰۔ محاضرات سیرت، ص ۲۷۹۔
- ۲۱۔ دیکھئے ابن سعد 'الطبقات الکبریٰ' جلد ۳، دارصادر بیروت، ۱۹۸۵ء۔
- ۲۲۔ تاہم طبقات کے ایک اور مشہور راوی حسین بن محمد بن فہم بغدادی (م ۲۸۹ھ) تھے۔ جن کی طرف قاضی اطہر مبارک پوری نے اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے تدوین سیرومغازی، ص ۲۵۱۔
- ۲۳۔ فواد سیزگین، ص ۱۸۰۔
- ۲۴۔ تفصیل کے لیے دیکھئے سخاوی 'الاعلان بالتونیح، اردو ترجمہ تاریخ کی تاریخ' مترجم محمد یوسف، ص ۱۸۲ او بعدہ۔
- ۲۵۔ فواد سیزگین، ص ۱۸۰۔
- ۲۶۔ ایضاً۔
- ۲۷۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۳۱۹۔

## دور ثانی کے دیگر سیرت نگار

گذشتہ فصل میں دور ثانی کے تین اہم سیرت نگاروں کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔ دوسری صدی ہجری کے وسط سے تیسری صدی ہجری کے اواخر کے عرصہ میں، جو کہ عباسیوں کا دور عروج تھا، فواد سبزیگین مزید دس ایسے سیرت نگاروں کا حوالہ دیتے ہیں جو صاحب کتاب المغازی والسیرۃ تھے لیکن یہ فہرست حتمی نہیں ہے، مزید تحقیق و تلاش کی بنیاد پر اس فہرست میں متعدد سیرت نگاروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جنہوں نے سیرت و مغازی پر مستقل کتابیں تالیف کیں۔ ان سیرت نگاروں کا ایک اجمالی تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تذکرہ زمانی ترتیب سے ہے، اور زمانی ترتیب میں بھی سنہ وفات کا لحاظ کیا گیا ہے۔

### ۱۔ معمر بن راشد (م ۱۵۴ھ / ۷۷۱ء)

ابو عمرو معمر بن راشد ۹۷ھ / ۷۱۴ء میں پیدا ہوئے مولیٰ بنی ازد تھے۔ ان کا وطن بصرہ تھا۔ اہل تاہم انہوں نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں مستقل سکونت اختیار کرنی تھی، نہایت ثقہ، حافظ حدیث، حجت اور سیر و مغازی کے امام و مصنف ہیں اس علم میں محمد بن شہاب زہری کے تلمیذ خاص اور ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں۔ ان کے اساتذہ و تلامذہ میں مشاہیر آئمہ دین شامل ہیں۔ معمر نے اپنی جوانی کے زمانے میں بصرہ کے مشہور محدث قتادہ بن دعامہ (م ۱۱۴ھ) سے حدیث کی سماعت کی تھی۔

معمر کو ان کے آقا نے پارچہ فروشی کی غرض سے مدینہ بھیجا تھا۔ یہاں انہوں

نے امام زہری کے حلقہ درس میں شرکت کی اور ان سے حدیث پڑھنے لگے۔<sup>۲</sup>  
 معمر بن راشد حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہمام بن منبہ سے حدیث کی تعلیم  
 کے لیے یمن گئے تو وہیں کے ہو رہے، وہیں انہوں نے شادی کی اور وہیں وفات پائی،  
 اس کی وجہ یہ تھی کہ یمن میں اس پائے کا کوئی محدث ان سے پہلے نہیں گیا تھا، لہذا صنعا  
 کے لوگوں نے انہیں وہیں روکنے کے لیے انہیں شادی کی ترغیب دی اور انہوں نے وہاں  
 شادی کر لی اس کے بعد وہ کبھی کبھی بصرہ جاتے رہتے تھے مگر پھر یمن واپس آجاتے تھے۔  
 یہیں اٹھاون سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی اور صنعا میں دفن ہوئے۔

معمر بن راشد اعلیٰ درجے کے اخلاق و کردار کے مالک تھے۔<sup>۳</sup> انہیں حدیث  
 کے میدان میں بھی اچھی شہرت حاصل ہے۔ ان کے بارے میں ابن جریج کا قول بتایا  
 جاتا ہے کہ: ”اس شخص کی پیروی کرو کیونکہ اس کے معاصرین میں سے کوئی بھی اس سے  
 زیادہ جاننے والا نہیں“۔<sup>۴</sup>

ابن الندیم نے انکی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔<sup>۵</sup> انہوں نے کتاب المغازی  
 موضوع کے اعتبار سے مرتب کی۔ ان کا شمار ابواب کے اعتبار سے مغازی مرتب کرنے  
 والے ابتدائی محدثین میں ہوتا ہے۔<sup>۶</sup> معمر بن راشد کی کتاب المغازی کا بیشتر حصہ  
 عبدالرزاق صنعانی نے کتاب المصنف میں اپنی روایت سے بیان کر دیا ہے اور مصنف کی  
 اشاعت کے بعد وہ محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کی کتاب المغازی میں سیرت رسول اللہ کے  
 علاوہ انبیائے سابقین کے حالات بھی مذکور ہیں۔ تاریخ طبری میں اس کے کئی اقتباسات  
 ہیں۔<sup>۸</sup> مزید براں ابن سعد اور طبری کی تاریخوں میں معمر بن راشد کے حوالے سے عہد  
 عثمانی و معاویہ کے اہم واقعات نقل ہوئے ہیں۔<sup>۹</sup> معمران رواۃ میں سے ہیں جن سے  
 واقدی نے کثرت سے روایات لی ہیں۔ ابن سعد نے ان کے اخبار عبدالرزاق بن ہمام  
 کے واسطے سے لیے ہیں جو یمن کے باشندے اور معمر کے شاگرد تھے۔<sup>۱۰</sup>

مغازی کے علاوہ ان کی دو اور اہم تصانیف تھیں۔

(۱) الجامع: ابواب فقہ کے بجائے الجامع کی احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ اس میں علم حدیث کے بعض اہم مباحث بھی مذکور ہیں، الجامع کے راوی معمر بن راشد کے شاگرد امام عبدالرزاق ہیں جنہوں نے اپنی کتاب مصنف کے تکرار میں بہت سی احادیث کا اضافہ کر دیا ہے۔ ”مصنف عبدالرزاق“ مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی تحقیق و تعلق سے بیروت سے آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ۱۱

(۲) تفسیر: امام معمر بن راشد نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی تھی جس کی

تہذیب امام عبدالرزاق نے کی تھی، اس کا جزو اول ہی اب دستیاب ہے۔ ۱۲

## ۲۔ عبدالرحمن بن عبدالعزیز حنفی (م ۱۶۲ھ / ۷۷۸ء)

ابو محمد عبدالرحمن بن عبدالعزیز حنفی حضرت ابو امامہ اسعد بن سہل بن حنیف کی اولاد سے ہیں۔ ۱۳ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے جبکہ بعض لوگوں نے ان کو حضرت عثمان بن حنیف کی اولاد سے بتایا ہے ۱۴۔ ان کے شیوخ میں ابن شہاب زہری اور عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن حزم انصاری، مغازی کے مصنف اور عالم ہیں اور ان کے تلامذہ میں محمد بن عمر الواقدی مصنف مغازی ہیں۔ کثیر الحدیث محدث اور سیرت کے عالم تھے۔ آنکھوں سے معذور تھے ۱۶۲ھ میں ستر سال سے زائد عمر میں انتقال ہوا۔

الحنفی کی کتاب السیرت، واقدی کی کتاب کا بنیادی ماخذ ہے، تاریخ طبری میں بھی اس کے اقتباسات ملتے ہیں ۱۵ جبکہ اطہر مبارک پوری انہیں صاحب کتاب نہیں بتاتے۔ ۱۶

## ۳۔ ابو معشر السندي (م ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء)

ابو معشر نجیع بن عبدالرحمن سندي بنو مخزوم کی ایک خاتون کے مکاتب تھے ۱۷،

انہوں نے زر کتابت ادا کر کے آزادی حاصل کر لی تھی۔ ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے ان کی ولاء خریدی تھی ۱۸ یعنی ان کے سابق آقاؤں کو رقم دے کر انہیں اپنا مولیٰ بنا لیا تھا، ازاں بعد انہیں آزاد کر دیا تھا۔ ام موسیٰ خلیفہ ابو جعفر المنصور کی بیوی اور اس کے بیٹے مہدی کی ماں تھی۔

ایک زمانے میں یمن کے حدود میں سندھیوں کی بڑی کثرت تھی، ان ہی میں ابو معشر کا خاندان تھا، ایک مرتبہ یزید بن مہلب ازدی نے یمامہ اور بحرین میں جنگ کی اسی میں ابو معشر گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ ان کی زبان میں لکنت تھی اور عربی الفاظ و حروف اچھی طرح سے ادا نہیں کر سکتے تھے، کعب کو قعب کہتے تھے۔ ۱۹ ابتداء میں خیاطی کرتے تھے۔ ابو معشر مدینہ کے مشہور فقہاء اور محدثین میں سے تھے۔ ذہبی نے ان کو حافظ حدیث، فقیہ اور صاحب المغازی والاخبار لکھا ہے۔ انہوں نے محمد بن کعب قرظی، موسیٰ بن یسار، نافع، ابن منکدر، محمد بن قیس وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا اور ان سے ان کے ایک بیٹے محمد، عبدالرزاق، محمد بن بکار، منصور بن مزاحم وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ ۲۰

ان کے بارے میں علماء مختلف الخیال ہیں۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں۔

امام احمد ابن حنبل کہتے تھے کہ مغازی کے بڑے عالم تھے اور صدوق تھے مگر سند درست نہیں رکھتے تھے۔

ابوزرعہ کہتے ہیں صدوق ہیں۔

امام نسائی کہتے ہیں قوی نہیں ہیں۔

ذہبی کہتے ہیں کہ امام نسائی نے ان سے حجت پکڑی ہے البتہ شیخین نے ان کی

کوئی حدیث ذکر نہیں کی۔ ۲۱

امام شافعی ان سے روایت کرتے تھے

ابن سعد ان کو کثیر الحدیث اور ضعیف بتاتے ہیں۔ ۲۲

ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابو معشر کو حدیث اور تاریخ میں خاص مقام حاصل ہے اور ان کی تاریخ سے ائمہ نے استشہاد کیا ہے۔ ان کے نزدیک بطور مورخ ابو معشر کا پایہ ابن اسحاق سے بلند ہے لیکن محدثین نے ان کی روایتوں کی تضعیف کی ہے۔ ۲۳

ابو معشر مدینہ کے فقہا اور محدثین میں خاص مقام و مرتبہ کے حامل تھے مگر ان کی شہرت سیر و مغازی کے عالم اور مصنف کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ فن مغازی میں ان کے شیخ ہشام بن عروہ اور شاگرد واقدی ہیں۔ مدینہ میں وہ ان علماء کی مجالس علمی میں بیٹھا کرتے تھے جہاں مغازی کا تذکرہ ہوتا تھا، گویا ابتداء سے ہی ان کا رجحان علم المغازی کی طرف تھا اور اسی میدان میں انہیں آگے چل کر شہرت اور ناموری ملی۔ ۲۴

ابو معشر کے آخری نو دس سال بغداد میں گذرے ۱۶۰ھ میں عباسی خلیفہ مہدی حج کے بعد مدینہ منورہ آیا اس وقت ابو معشر علمائے مدینہ میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اور مہدی کی والدہ ام موسیٰ کی ولاء میں تھے۔ مہدی نے انہیں بغداد آنے کی دعوت دی اور ایک ہزار دینار بھی پیش کیے۔ ابو معشر ۱۶۱ھ میں اپنے اہل و عیال سمیت بغداد چلے گئے اور زندگی کے باقی دن وہیں تحدیث اور روایت میں بسر کیے، آخری دو سالوں میں کبرسنی اور ضعف کی وجہ سے ہوش و حواس بجا نہیں رہے تھے، وہیں ۱۷۰ھ میں انتقال کیا۔ ہارون الرشید نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ابو معشر نے بغداد میں کتاب المغازی لکھی۔ واقدی ابو معشر کے شاگرد تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں ”ابو معشر کے شاگرد واقدی کو خلیفہ ہارون الرشید مدینہ سے بغداد لے گیا تھا اور انہوں نے وہیں ابو معشر سے ان کی کتاب المغازی کی روایت کی۔“ ۲۵ یہ بات محل نظر ہے کیونکہ واقدی ۱۸۰ھ میں بغداد گئے تھے، جبکہ ابو معشر کو فوت ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ واقدی نے ابو معشر سے جو روایت لی ہوگی وہ مدینہ میں لی

ہوگی۔ بہر حال ابن سعد نے طبقات میں واقدی کی سند سے ابو معشر کی بہت سی روایات بیان کی ہیں۔

ابو معشر کی کتاب المغازی ۲۶ کے خاص راوی ان کے بیٹے محمد اور پوتے داود ہیں۔ محمد بن ابو معشر سندی، ان کے ساتھ ہی مدینہ سے بغداد گئے تھے انہوں نے اپنے والد کی کتاب المغازی کی روایت کی۔ اور محمد سے ان کے بیٹے ابو سلیمان داود بغدادی نے اس کتاب کی روایت کی، پھر ان سے قاضی احمد بن کامل نے روایت کی۔ ۲۷

ابو معشر کی کتاب المغازی کے ساتھ بھی اہل علم نے اعتنا کیا اور وہ مدتوں ان میں متداول رہی۔ ان کی کتاب المغازی رسول اللہ کی حیات مبارک کے جملہ واقعات کو محیط ہے۔ ابو معشر کی کتاب المغازی کے اقتباسات واقدی کی کتاب المغازی، ابن سعد کی طبقات اور ابن جریر طبری کی تاریخ میں شامل ہیں۔ ۲۸

اس کے علاوہ ابو معشر کی ایک ”تاریخ الخلفاء“ کا بھی پتہ چلتا ہے جس سے طبری نے کافی استفادہ کیا ہے۔ ۲۹ اس کے بارے میں جوزف ہو رووٹس لکھتے ہیں ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغازی کے علاوہ ابو معشر نے صدر اسلام کے حوادث کی ایک تجزیاتی ”تاریخ“ بھی سنہ وار لکھی تھی۔ یہ ۷۰ھ تک کے وقائع تھے۔ آخری واقعہ جو ان کی کتاب سے طبری نے اخذ کیا ہے وہ خلیفہ الہادی کی وفات ہے جو ۷۰ھ کے موسم بہار میں ہوئی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد خود ابو معشر بھی انتقال کر گئے۔ مغازی میں وہ لازماً نہیں تو اکثر اپنی سند بیان کرتے ہیں۔ مگر تاریخ میں انہوں نے کوئی اسناد نہیں دیں۔“ ۳۰

### ۴۔ سلیمان بن بلال تیمی (م ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء)

آپ کی کنیت ابو ایوب اور ابو محمد تھی، قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق کے مولیٰ تھے، اسی نسبت ولاء کی وجہ سے تیمی کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے بلند پایہ حافظ حدیث، اور مشہور مفتی تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ بربری نسل کے خو برو، خوش

ہئیت اور صاحب فہم و فراست عالم تھے۔ ۳۱ کچھ عرصہ خراج وصول کرنے پر بھی متعین رہے۔ ان کا انتقال ۱۷۲ھ میں ہوا۔ سلیمان بن بلال تیمی نے مدینہ کے اجلہ تابعین سے روایت کی ہے، ان کے شیوخ میں ہشام بن عروہ، اور موسیٰ بن عقبہ مغازی کے مشہور عالم اور مصنف ہیں، ان کی زیادہ روایات یحییٰ بن سعید سے ہیں، محمد بن شہاب زہری سے ملاقات کی ہے مگر ان کی احادیث کی روایت ان کے تلامذہ سے کی ہے۔

تذکرہ نگاروں نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ وہ کتاب المغازی کے مصنف ہیں اور دوسری صدی ہجری کے علمائے مغازی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری، کتاب المغازی میں اس کا صریح طور سے ذکر کیا ہے اور اس کی کئی روایات بیان کی ہیں۔ ۳۲

## ۵۔ عبدالملک بن محمد بن ابوبکر انصاری (م ۱۷۶ھ / ۷۹۲ء)

عبدالملک بن محمد بن ابوبکر بن عمرو بن حزم انصاری کے جد اعلیٰ عمرو بن حزم کو سترہ سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ نے ۱۰ھ میں نجران کا امیر مقرر فرما کر ان کے پاس اسلامی شرائع و احکام پر مشتمل مفصل مکتوب روانہ فرمایا تھا۔ ۳۳ فن حدیث اور سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا ان کے دادا وہ شخص ہیں جنہوں نے اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، ان کی رشتہ کی دادی عمرہ حضرت عائشہ کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے۔ اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی۔ ۳۴

ابن الندیم نے ان کی کتاب المغازی کی تصریح کی ہے ۳۵ انہوں نے مدینہ میں کتاب المغازی لکھی اور بغداد میں اس کی روایت کی یہ معلوم نہیں کہ وہ بغداد کب آئے، ہارون الرشید نے ان کو بغداد کے مشرقی علاقے کا قاضی مقرر کیا تھا مگر اس کے چند ہی دن بعد ۱۷۶ھ میں انتقال کر گئے، ہارون الرشید نے نماز جنازہ پڑھائی اور عباسیہ



بنت مہدی کے قبرستان میں دفن کیے گئے ۳۶۔ سیرتج بن نعمان جوہری کا بیان ہے کہ عبد الملک بن محمد بن ابو بکر ہمارے یہاں بغداد آ کر مقیم ہوئے اور ہم نے ان سے مغازی کی روایات لکھیں جن کو انہوں نے اپنے چچا عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کیا تھا۔ ۳۷

## ۶۔ علی بن مجاہد کابلی (م ۱۸۲ھ / ۷۹۸ء)

ابوالمجاہد علی بن مجاہد بن مسلم بن ریح کابلی کے ابا و اجداد میں سے کوئی شخص کابل سے جنگی قیدی بن کر قبیلہ کندہ کی غلامی میں آیا تھا۔ بعض علماء نے ان کو کابلی کے ساتھ ہندی بھی لکھا ہے کیونکہ اس زمانے میں بھستان اور کابل کے بعض علاقے سندھ اور مکران میں تھے بلکہ سمعانی کابل کو بلاد ہند کا مشہور علاقہ بتاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ابو معشر سندی کی طرح یہ بھی سندھ اور مکران کے علاقے کے ہوں۔ علی بن مجاہد خراسان کے شہر رے کے قاضی تھے۔ ۳۸

انہوں نے مغازی کی تعلیم ابو معشر سندی اور محمد ابن اسحاق سے حاصل کی اور حدیث کی روایت حجاج بن ارطاة، مسعر بن کدام، سفیان ثوری، ابو جعفر رازی، عنبسہ بن سعید قاضی رے وغیرہ سے کی، ان سے احمد بن حنبل، جریر بن عبد الحمید، محمد بن عیسیٰ بن طباع، زیاد بن ایوب طوسی وغیرہ نے روایت کی۔ ۳۹

علی بن مجاہد کابلی نے بغداد آ کر محمد بن اسحاق اور جعد بن ابو جعد وغیرہ سے روایت کی۔ ۴۰ غالباً بغداد ہی میں انہوں نے ابو معشر سندی سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کتاب المغازی تصنیف کی جس کے بارے میں یحییٰ بن معین کی دو آراء ملتی ہیں ایک راوی کے مطابق علی بن مجاہد کے بارے میں یحییٰ بن معین کی رائے یہ تھی کہ ”وہ حدیث وضع کرتے تھے، اور انہوں نے کتاب المغازی لکھی تو اپنی باتوں کے لیے اسناد وضع کرتے تھے۔“

جبکہ ایک دوسرے راوی نے علی بن مجاہد کے بارے میں یحییٰ بن معین کا یہ قول

نقل کیا ہے کہ میں نے ابو مجاہد کابلی کو ہشیم بن بشر کے دروازے پر دیکھا ہے، میں ان میں کوئی نقص نہیں دیکھتا ہوں۔ البتہ میں نے ان سے کچھ نہیں لکھا ہے۔“ ۴۱ بہر حال ارباب نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔ ۴۲ ان کے بعض ہم وطن معاصرین نے ان کو کذاب کہہ کر ان کے ابن اسحاق سے سماع تک کا انکار کیا ہے، یہ یاد رہے کہ معاصرین کی جرح محدثین کے یہاں معتبر نہیں ہے۔ بہر حال ان کی روایات تاریخ طبری وغیرہ میں موجود ہیں۔

### ۷۔ زیاد بن عبد اللہ بکائی کوفی (م ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء)

ابو محمد زیاد بن عبد اللہ بن طفیل بکائی، ابن اسحاق کے ارشد اوثق راوی ہیں، بکائی نے ابن اسحاق سے ان کی کتاب المغازی کی روایت میں بڑے ایثار و اخلاص سے کام لیا ہے، گھر بار فروخت کر کے ابن اسحاق کے ساتھ ساتھ رہے اور ان سے روایت کی ہے۔ صالح بن محمد کا بیان ہے: ”زیاد بن عبد اللہ بکائی سے زیادہ صحیح کسی کے پاس ابن اسحاق کی کتاب المغازی نہیں ہے۔ زیاد خود ضعیف ہیں مگر اس کتاب کے بارے میں وہ سب سے زیادہ معتبر ہیں کیونکہ انہوں نے اپنا گھر بار فروخت کر کے ابن اسحاق کے ساتھ ساتھ سفر کیا، اور ان سے اس کتاب کا سماع کیا“۔ ۴۳ ابن اسحاق نے زیاد بن عبد اللہ بکائی کو دومرتبہ کتاب المغازی کا املا کرایا تھا۔ سیرت ابن ہشام کا مدار زیادہ تر بکائی کی روایت پر ہے۔ بکائی نے محمد ابن اسحاق کے علاوہ حمید الطویل، عاصم الاحول، سلیمان الأعمش، حجاج بن ارطاة اور کئی دوسرے آئمہ حدیث سے روایت کی ہے ان کے تلامذہ میں امام احمد ابن حنبل، ابو غسان ہندی، سعید بن ابان اموی کے علاوہ ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے خصوصی راوی اور سیرت ابن ہشام کے مصنف عبد الملک ابن ہشام کوفی بصری بھی شامل ہیں۔ بکائی نے بغداد آ کر ابن اسحاق سے مغازی کی روایت کی، اور محمد بن سالم سے اس کو حل کیا، اس کے بعد کوفہ واپس آ گئے اور وہیں عباسی خلیفہ ہارون

الرشید کے زمانہ میں ۱۸۳ھ میں فوت ہوئے اور کوفہ میں ہی دفن ہوئے۔ ۴۴

## ۸۔ ابراہیم بن سعد بن ابراہیم مدنی زہری (م ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء)

ابو اسحاق امام ابراہیم بن سعد جلیل القدر صحابی حضرت عبدالرحمن بن عوف کے پڑپوتے ہیں، مدینہ منورہ کے رہنے والے ممتاز حافظ حدیث ہیں۔ ان کے والد سعد مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ آپ خود بھی مدینہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد سعد کے علاوہ ابن شہاب زہری، صفوان بن سلیم، یزید بن عبداللہ الہادی، صالح بن کیسان، محمد ابن اسحاق وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان سے ان کے دونوں صاحبزادوں یعقوب اور سعد کے علاوہ امام احمد بن حنبل، منصور بن ابی مزاحم، حسین بن سیار حرانی اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اکتساب فیض کیا۔ کبار علماء میں سے شعبہ اور لیث ان سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے مدینہ سے بغداد آکر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور ان کی اولاد نے بھی علمی زندگی بسر کی۔ ان کو ہارون الرشید نے بیت المال کا محاسب و نگران بنایا تھا۔ آپ کے تاریخ وفات ۱۸۳ھ ہے آپ نے ۷۵ برس عمر پائی۔ ۴۵ آپ بھی محمد ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے راوی تھے۔ ۴۶ انہوں نے سیر و مغازی کی تعلیم اپنے والد سعد بن ابراہیم زہری، محمد بن شہاب زہری، ہشام بن عروہ، اور محمد بن اسحاق سے حاصل کی اور ابن اسحاق سے ان کی کتاب المغازی کی روایت کر کے اس کا درس دیا اور اس میں حک و اضافہ کر کے خود بھی کتاب المغازی لکھی، جو ابن اسحاق کے دوسرے تلامذہ کی روایت سے کچھ مختلف تھی۔ ۴۷

خطیب بغدادی نے امام بخاری کی روایت سے ابراہیم بن حمزہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابراہیم بن سعد کے پاس محمد ابن اسحاق کی ستر ہزار سے زائد حدیثیں احکام میں تھیں، مغازی ان کے علاوہ ہیں، ابراہیم بن سعد مدینہ میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے حدیث کے عالم تھے۔ ۴۸

احمد بن محمد بن ایوب وراق بغدادی (م ۲۲۸ھ) نے ابراہیم بن سعد سے ابن اسحاق کی کتاب المغازی پڑھی تھی، فضل بن یحییٰ برکی نے بھی ان کے ساتھ پڑھا تھا۔ ۴۹

## ۹۔ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء)

ابو معاویہ ہشیم بن ابو حازم بشیر بن قاسم بن دینار سلمی، نجاری الاصل تھے، وطن واسط ۵۰ تھا۔ بعد میں بغداد آگئے۔ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے انہوں نے ابن شہاب زہری اور سلیمان بن ہلال تیمی کے علاوہ اپنے والد نیز مامون بن قاسم بن مہران، اعمش، یحییٰ بن سعید انصاری، عبدالعزیز بن صہیب وغیرہ سے حدیث کی روایت کی اور ان سے امام مالک، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، سعید بن ہشیم (بیٹے)، شعبہ بن حجاج، وکیع بن جراح، علی بن عبداللہ مدینی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے روایت کی۔ ۵۱

ان کا شمار ابتدائی مصنفین میں ہے جنہوں نے دوسری صدی کے وسط میں فقہی ترتیب پر احادیث کو مرتب و مدون کیا تھا۔ ان کی تصانیف میں کتاب المغازی بھی ہے گوکہ ابن الندیم اس کا تذکرہ نہیں کرتا۔ کتاب المغازی کے علاوہ ان کی درج ذیل تصانیف بھی تھیں:

۱۔ کتاب السنن فی الفقہ

۲۔ کتاب التفسیر

۳۔ کتاب القرات ۵۲

## ۱۰۔ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفزاری (م ۱۸۸ھ / ۸۰۴ء)

ابراہیم بن محمد بن الحارث بن اسحاق بن خارجۃ الفزاری کوفہ میں پیدا ہوئے، پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد چلے آئے، آخر عمر میں المصیبتہ ۵۳ میں اسلامی سرحد کی نگہبانی کرتے رہے اور وہیں ۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ الفزاری نامور مورخ اور محدث

تھے۔ ان کو علماء نے متفقہ طور پر صدوق اور ثقہ مانا ہے۔ ۵۴ ابن الندیم ان کی کتاب ”کتاب السیر فی الاخبار ولاحداث“ کا ذکر کرتا ہے۔ جس کی روایت ان سے ابو عمرو معاویہ بن عمرو الرومی (م ۲۱۵ھ بغداد) نے کی۔ ۵۵ اس کا ایک مخطوطہ فاس میں محفوظ ہے۔ ۵۶

### ۱۱۔ سلمہ بن الفضل ابرش انصاری (م ۱۹۱ھ / ۸۰۷ء)

ابو عبد اللہ سلمہ بن فضل الابرش انصاری رازی مولیٰ انصار تھے رے کے قاضی رہے، محمد ابن اسحاق کے شاگرد خاص، ان کی کتاب المغازی کے راوی ۵۷ اور خود کتاب المغازی کے مصنف تھے، بعض تذکرہ نگار ان کو سلمۃ ابرش اور بعض ازرق لکھتے ہیں۔ ۵۸ انہوں نے محمد ابن اسحاق، حجاج بن ارطاة، سفیان ثوری، اسحاق بن راشد جزری، ابو جعفر رازی، زہیر بن معاویہ، ابراہیم بن طہمان وغیرہ سے روایت کی اور ان سے عثمان بن شیبہ، عبد اللہ بن عمر قریشی، یحییٰ بن معین وغیرہ نے روایت کی۔ ابتداء میں مودب و معلم تھے بعد میں رے کے قاضی ہوئے۔ ثقہ عالم تھے۔ ان کے بارے میں یحییٰ بن معین نے جریر کا یہ قول نقل کیا ہے ”بغداد سے خراسان تک ابن اسحاق کے بارے میں سلمہ بن فضل سے زیادہ معتبر و مستند کوئی نہیں ہے“۔ ۵۹

ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”انہوں نے ابن اسحاق سے کتاب المغازی کی روایت کی ہے، ان کی روایتوں سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے مگر ابن اسحاق کے بارے میں ثقہ ہیں۔“ ۶۰

سلمہ ابرش کا انتقال ۱۹۱ھ میں ہوا ۶۱ اس وقت ان کی عمر ایک سو دس سال کی تھی۔ یہ ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے اولین راوی تھے، جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا کہ ابن خطیب بغدادی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابن اسحاق نے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور سے ملاقات سے قبل ہی اپنی کتاب المغازی کو مکمل کر لیا تھا اور اس کا

ایک نسخہ سلمہ بن فضل کے حوالے کیا تھا۔ ۶۲۔

## ۱۲۔ محمد بن سلمہ باہلی حرانی (م ۱۹۱ھ / ۸۰۷ء)

ابو عبد اللہ محمد بن سلمہ بن عبد اللہ باہلی حرانی بنی بابلہ کے مولیٰ تھے۔ الجزیرہ کے شہر حران میں مستقل قیام کرتے تھے۔ انہوں نے ابن اسحاق سے کتاب المغازی کی روایت کی ہے، ثقہ، صدوق، محدث اور صاحب فضل و کمال فقیہ و مفتی تھے۔ انہوں نے محمد ابن اسحاق کے علاوہ اور بہت سے محدثین سے بھی روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں احمد ابن حنبل، ابو جعفر عبد اللہ بن محمد نفیلی، احمد بن ابو شعیب حرانی، احمد بن بکار حرانی، موسیٰ بن عبد الرحمن انطاکی اور بہت سے محدثین نے روایت کی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے سیرۃ ابن اسحاق کے جو اجزاء حاصل کیے وہ یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ حرانی ہی کے روایت کردہ ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق و تلاش کے نتیجے میں محمد بن سلمہ حرانی کے نسخہ مغازی ابن اسحاق کا ایک حصہ اہل علم تک پہنچا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا ڈاکٹر صاحب نے سیرۃ ابن اسحاق کے نام سے ابن اسحاق کے دو تلامذہ یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ کی کتابوں کے اجزاء شائع کیے ہیں۔ اس میں صفحہ نمبر ۲۸۵ سے ۳۱۶ تک محمد بن سلمہ کی کتاب کا حصہ ہے۔ جس میں غزوہ بدر کے درمیان سے غزوہ احد کے درمیان تک کے واقعات ہیں اور یہ پورا حصہ صرف ابن اسحاق کی روایت پر مشتمل ہے گویا ابن اسحاق کی اصل کتاب المغازی ہے، اس میں دوسرے شیوخ کی روایت نہیں ہیں۔ ۶۳۔

## ۱۳۔ یحییٰ بن سعید اموی (م ۱۹۴ھ / ۸۰۹ء)

ابو ایوب یحییٰ بن سعید بن آبان بن سعید بن العاص اموی ۱۱۴ھ / ۷۳۲ء کے لگ۔ بھگ پیدا ہوئے۔ ۶۴۔ خاندان بنو امیہ کے ممتاز فرد ہیں۔ حافظ حدیث، عالم سیرت

مغازی اور محمد ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے راوی تھے خود بھی 'کتاب المغازی' کے مصنف تھے۔ ان کا وطن کوفہ تھا تاہم آخری عمر میں بغداد چلے گئے تھے۔ ۶۵ یحییٰ کا بیان ہے کہ میرے بھائی محمد بن سعید نے ابن اسحاق سے کتاب المغازی کی روایت سماعاً کی ہے (یعنی سنی ہے) جبکہ میں نے، قاضی ابو یوسف اور چند دوسرے ساتھیوں نے عرضاً روایت کی ہے۔ یعنی انہوں نے ابن اسحاق کے سامنے ان کی کتاب المغازی پڑھی ہے۔ تاہم قاضی ابو یوسف نے تھوڑا بہت سماع بھی کیا ہے۔ ۶۶ یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروہ، برید بن عبداللہ بن ابی بردہ، اعمش، اور ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں۔ ۶۷ ذہبی کے بیان کے مطابق یحییٰ بن سعید نے ابن اسحاق سے کتاب المغازی پڑھ کر خصوصی توجہ دی اور اس میں اضافہ کیا۔ ۶۸ اس اضافے کی وجہ سے وہ صاحب کتاب المغازی کہلائے، ان کی کتاب المغازی، اہل علم میں بہت بعد تک متداول رہی۔ اس کی ایک طویل عبارت امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں درج کی ہے۔ علامہ ابن جریر طبری نے کئی موقعوں پر ان کی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی۔ ۶۹ یحییٰ بن سعید کے کئی تلامذہ نے ان کی کتاب المغازی کی روایت کی ہے۔ ان میں ان کے بیٹے سعید بن یحییٰ بہت مشہور ہوئے اور خود بھی صاحب کتاب المغازی ہوئے یحییٰ بن سعید کا انتقال شعبان یا شوال ۱۹۴ھ میں ہوا۔ ۷۰

### ۱۴۔ ابو العباس الاموی (م ۱۹۵ھ / ۸۱۰ء)

ابو العباس الولید بن مسلم اموی ۱۱۹ھ / ۷۳۷ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ امام اہل شام الاوزاعی اور جریج وغیرہ سے حدیث کی روایت کی۔ بلند پایہ مورخ اور محدث تھے۔ ان کا لقب "عالم شام" تھا۔ ابو العباس نے تقریباً ستر کتابیں تالیف کیں، جن میں کتاب المغازی اور کتاب السنن بھی شامل ہیں۔ ابو العباس کی کتاب المغازی کا ایک ٹکڑا

امام بخاری نے باب المغازی میں نقل کیا ہے۔ انہوں نے حج سے واپسی پر ۱۹۵ھ/۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ اے

## ۱۵۔ ولید بن مسلم قرشی دمشقی (م ۱۹۵ھ/۸۱۰ء)

ابو العباس ولید بن مسلم قرشی دمشقی مولیٰ بنی امیہ اور مولیٰ بنی ہاشم، محدث شام و فقیہ اور سیر و مغازی کے عالم اور مصنف تھے۔ ان کی ولادت ۱۱۹ھ میں ہوئی۔ انہوں نے امام ادزاعی، ابن جریج، ابن عجلان، ابن ابی ذئب، سفیان ثوری، عبدالعزیز بن ابی رواد، ثور بن یزید وغیرہ سے روایت کی اور ان سے امام لیث بن سعد، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن عبداللہ مدینی، حمیدی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۲۷ مختلف علوم میں ان کی متعدد کتابیں تھیں، ابن الندیم ان کی کتاب المغازی کا ذکر کرتا ہے ۳۷ ان کی کئی کتابیں تاریخ پر بھی تھیں۔ ۴۷ انتہائی عالم، ثقہ اور کثیر العلم تھے۔

## ۱۶۔ عبداللہ بن وہب (م ۱۹۷ھ/۸۱۲ء)

ابو محمد عبداللہ بن وہب بن محمد قرشی، مولیٰ بنی فہم، امام مالک کے اجل تلامذہ میں سے تھے، ان کے دادا افریقہ کی بربر نسل سے تھے، ابن وہب نے مصر، حجاز، عراق کے تقریباً چار سو علمائے محدثین سے روایت کی ہے اور تقریباً بیس سال تک امام مالک کے حلقہ درس سے وابستہ رہے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے تین سو ساٹھ اہل علم سے فیض اٹھایا ہے اگر مالک اور لیث نہ ہوتے تو میں گمراہ ہو جاتا اور یہ کہ ”ابن شہاب زہری کے تلامذہ میں سے بیس سے زائد لوگوں کو پایا ہے“۔ ۵۷

ابن وہب نہایت عابد و زاہد اور بزرگ عالم تھے سال کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ میں اسکندریہ میں مرابطت کرتے، ایک حصہ میں مصر میں حدیث کا درس دیتے تھے اور ایک حصے میں حج ادا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ کتابیں بھی مدون کرتے



تھے۔ ابن قاسم کا قول ہے کہ علم حدیث کو جس طرح انہوں نے مدون کیا ہے کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ یہ تصانیف کثیرہ کے مصنف ہیں۔ قاضی عیاض کا بیان ہے کہ ان کی بہت سی عظیم نفع بخش کتابیں ہیں، اس کے بعد ان کی تصانیف میں سے دس کتابوں کا ذکر کیا ہے، جس میں کتاب الاموال اور کتاب المغازی بھی ہے۔ ۶۷

ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن منذر خرامی مدنی (م ۲۳۶ھ) نے ان سے کتاب المغازی کی روایت کر کے اس کا درس دیا ہے۔ ابن وہب کا انتقال ۱۹۷ھ میں مصر میں ہوا۔ انتقال کے بعد ان کی کتابیں پانچ سو دینار میں فروخت کی گئیں۔

### ۱۷۔ یونس بن بکر شیبانی کوفی: (م ۱۹۹ھ/۸۱۴ء)

ابوبکر یونس بن بکر بن واصل شیبانی، بنی شیبان کے مولیٰ تھے۔ حافظ حدیث، فقیہ ومورخ اور محمد ابن اسحاق کے شاگرد خاص اور ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں۔ محکمہ مظالم کے امیر وحاکم تھے، امراء و حکام سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷۷ ذہبی نے تذکرہ الحفاظ میں ان کو حافظ، عالم، مورخ اور اصحاب المغازی لکھا ہے۔ ۸۷ آپ نے اعمش، ہشام بن عروہ، عمر بن ذر، محمد ابن اسحاق، کہمس بن حسن وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان سے ان کے بیٹے عبداللہ، ابوکریب، یحییٰ بن معین، ابن نمیر، ابوسعید اشجع، محمد بن عثمان بن کرامہ، احمد بن عبدالجبار عطاروی اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔ ۹۷

یونس بن بکر نے ابن اسحاق سے کتاب المغازی کی روایت کر کے قداماء کے طریقہ پر اس میں دوسری روایات کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے ان کی کتاب المغازی کی مستقل حیثیت ہو گئی اور علماء سیر و مغازی اور مورخین نے اس کتاب سے خصوصی اعتناء کیا۔ خلیفہ بن حیاط (م ۲۴۰ھ) ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی تاریخ میں ان کی روایات لی ہیں۔ پھر ان کی کتاب المغازی کی روایت کی گئی جن میں ایک اہم نام احمد بن عبدالجبار عطاروی کوفی (م ۲۷۲ھ) کا ہے۔ احمد بن عبدالجبار عطاروی کوفی ۷۷ھ میں

کوفہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں یونس بن بکیر، عبداللہ ادریس ادری، ابوبکر بن عیاش، حفص بن غیاث، وکیع بن جریح وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے ابوبکر بن ابی الدینا، ابوالقاسم بغوی، قاسم بن زکریا مطرز وغیرہ نے روایت کی۔ انہوں نے کوفہ سے بغداد آ کر وہاں یونس بن بکیر سے مغازی کی روایت کی۔ ۸۰۔

محمد ابن اسحاق کی کتاب المغازی کا وہ نسخہ جو ڈاکٹر حمید اللہ کی کوششوں سے منظر عام پر آچکا ہے انہی یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ کی روایات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب سیرت ابن اسحاق کے نام سے ۱۴۰۱ھ میں ترکی سے شائع ہوئی، بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ نقوش کے رسول نمبر جلد ۱۱ میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کتاب کو ”سیرت ابن اسحاق“ کے نام سے شائع کرایا ہے جو کتاب کی ابتداء سے ۲۸۰ صفحات تک ہے۔ یہ نسخہ انہوں نے یونس بن بکیر کی کتاب المغازی سے مرتب کیا ہے۔ یوں ابن اسحاق کی کتاب جو متداول نہیں رہی تھی اس کا معتد بہ حصہ اصل صورت میں سامنے آ گیا اور سیرت ابن ہشام میں جو کمی ہے اس کی بڑی حد تک تلافی ہو گئی۔

### ۱۸۔ ابو حذیفہ: (م ۲۰۶ھ / ۸۲۱ء)

ابو حذیفہ اسحاق بن بشر بن محمد النجاری، بلخ میں پیدا ہوئے، لیکن انہوں نے بخارا کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ انہوں نے محمد ابن اسحاق، عبدالملک بن جریج، امام مالک اور سفیان ثوری وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں لیکن یہ روایتیں ضعیف شمار کی گئی ہیں ۸۱۔

ابن الندیم نے ان کی درج ذیل کتب کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ کتاب المبتداء

۲۔ کتاب الفتح

۳۔ کتاب الردہ

۴۔ کتاب الجمل

۵۔ کتاب الالویہ

۶۔ کتاب صفین

۷۔ کتاب حضر زمزم۔ اس کے علاوہ ابن حجر نے ان کی ایک ”مسند“ کا بھی

تذکرہ کیا ہے۔ ۸۲۔

ان کتابوں کے راوی اسماعیل بن العطار البغدادی (م ۲۳۲ھ / ۸۴۷ء) ہیں، اور پھر استاد کی یہ کتابیں شاگرد ہی کے نام سے منسوب ہو گئیں۔ ابو حذیفہ نے ۲۰۶ھ میں بخاری میں وفات پائی۔ کتاب المبتداء کا چوتھا اور پانچواں جز، سیرت رسول اللہ سے متعلق ہے۔ پانچویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ کتاب خانہ طاہریہ، دمشق میں موجود ہے۔ ان کی احادیث کے چند اجزاء بھی وہیں ہیں ۸۳۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، اور ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ میں کتاب الفتوح کے بے شمار حوالے دیئے ہیں۔ ۸۴۔

### ۱۹۔ عبدالرزاق بن ہمام: (م ۲۱۱ھ / ۸۲۶ء)

آپ کی کنیت ابو بکر ہے، قبیلہ حمیر سے نسبت ولاء کی وجہ سے حمیری کہلاتے ہیں، صنعاء کے رہنے والے، ممتاز حافظ حدیث اور متعدد قیمتی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۸۵۔ انہوں نے حدیث کی روایت اپنے والد، چچا (وہب بن نافع) ابن جریج، اوزاعی، مالک بن انس، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وغیرہ سے کی اور ان سے ان کے شیخ سفیان بن عیینہ، وکیع بن جراح، احمد بن حنبل، اسحاق ابن راہویہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین وغیرہ نے روایت کی۔ ۸۶۔

عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں سات سال تک معمر بن راشد کی مجلس درس میں بیٹھا ہوں، امام احمد کا قول ہے کہ ”عبدالرزاق معمر کی حدیث کے حافظ تھے۔ میرے نزدیک ’عبدالرزاق عن معمر‘ والی حدیث اہل بصرہ کی حدیث سے زیادہ محبوب ہے۔“

ابراہیم بن عباد وبری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو تقریباً سترہ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔  
۸۷۔ حدیث میں انہیں ثقہ مانا گیا ہے، ان کی احادیث صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں  
مذکور ہیں۔ ۸۸۔

بعض لوگوں نے ان پر تشیع کا الزام لگایا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ حب علی میں  
غلو کرتے تھے اور حضرت علی پر، حضرت ابو بکر و عمر کو فضیلت یا ترجیح دینے کے قائل نہیں  
تھے اس الزام کے علی الرغم آئمہ اسلام نے ان سے تحصیل حدیث کی اور دور دراز سے سفر  
کے ان سے فیس اٹھایا۔ ۸۹۔

مغازی کے عالم تھے، معمر بن راشد کے علم کے وارث اور ان کی کتاب  
المغازی کی روایت کر کے خود کتاب المغازی کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب المغازی  
'کتاب المصنف' میں چھپ گئی ہے۔ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن فی  
الفقہ اور کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔ ۹۰۔ قاضی اطہر مبارک پوری یہ خیال ظاہر کرتے  
ہیں کہ کتاب السنن فی الفقہ، ان کی کتاب المصنف ہے جو گیارہ جلدوں میں شائع ہو چکی  
ہے، اور فقہی ترتیب پر ہے اس کی پانچویں جلد کے صفحہ ۳۱۳ سے صفحہ ۴۹۲ تک کتاب  
المغازی ہے، جس میں زیادہ تر روایات عبدالرزاق عن معمر عن الزہری کی سند سے ہیں۔  
دوسری روایات بھی ہیں یہ مغازی کی قدیم کتابوں میں سے ہے۔ ۹۱۔

## ۲۰۔ عبدالملک بن ہشام حمیری بصری: (م ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء)

ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب حمیری معاضری کا وطن بصرہ ہے مگر مصر میں  
مستقل طور سے آباد ہو کر وہیں ۲۱۸ھ میں انتقال کیا۔ تاریخ سیر و مغازی، انساب، ادب  
اور نحو کے مشہور عالم اور مصنف تھے ادب اور شعر میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ اپنے  
زمانے کے جید ترین علماء سے انہوں نے کسب فیض کیا ابو عبیدہ معمر بن شنی ۹۲۔ جو قرانی  
ادبیات اور لسانیات کے ماہر تھے ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ابن ہشام کے اپنے

والد اور دادا بھی صاحب علم تھے اور تاریخ کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے محمد ابن اسحاق کے شاگرد رشید زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی کی ابن اسحاق سے روایت کردہ کتاب المغازی کو اصل قرار دے کر اس میں حک و اضافہ کیا اور اس کی تنقیح کی۔ ذہبی لکھتے ہیں ”ابو محمد عبدالملک بن ہشام بصری نحوی، صاحب المغازی ہیں، جنہوں نے کتاب السیرة کو بہترین انداز میں مرتب کیا اور اس کو ابن اسحاق کے شاگرد بکائی سے نقل کیا۔“ ۹۳۔

ابن خلکان لکھتے ہیں ”یہی ابن ہشام ہیں جنہوں نے رسول اللہ کی مغازی و سیر مصنفہ ابن اسحاق کو جمع کر کے اس کی تہذیب کی اور تلخیص کی جس کی شرح سہیلی نے کی ہے اور یہی کتاب ”سیرة ابن ہشام“ کے نام سے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔“ ۹۴۔

ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کی کتاب میں سے ان بیانات کو حذف کر دیا جن کا براہ راست تعلق رسول اللہ سے نہیں بنتا تھا چونکہ ابن اسحاق کی کتاب کے پہلے حصے یعنی المبتداء پر محدثین کو اعتراضات تھے، اور اس حصہ میں اسناد کا اہتمام بھی نہیں تھا، یہ سب اسرائیلیات تھیں جن کا بڑا حصہ کلبی کی روایات کی بنیاد پر لیا گیا تھا۔ کلبی کے بیانات کے مستند یا غیر مستند ہونے پر ہمیشہ سوال اٹھا ہے لہذا ابن ہشام نے اس حصہ کو حذف کر دیا اور حضرت اسماعیل کے بعد سے مختصر بیان کر کے معد بن عدنان اور پھر رسول اللہ کے قبیلہ قریش اور قصی بن کلاب پر آگئے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کے ایسے اشعار بھی حذف کر دیئے جن سے اہل علم ناواقف تھے، چونکہ ابن ہشام خود بہت بڑے ادیب اور عالم تھے اس لیے وہ اس شعری مواد کو پرکھ سکتے تھے، جبکہ ابن اسحاق اپنے علم و فضل کے باوجود شعروادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں رکھتے تھے، ان کو یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ جس شعر کو وہ لے رہے ہیں اس کا درجہ کیا ہے اور یہ اس شخص کا ہے بھی کہ نہیں جس سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ ابن ہشام نے اپنی رائے سے کام لیتے ہوئے اس طرح کے غیر مستند قصائد نکال دیئے

اور صرف مستند قصائد ہی کتاب میں رہنے دیئے۔ ابن ہشام نے بعض ایسے واقعات، جو اس دور کے لحاظ سے مناسب نہیں تھے حذف کر دیئے مثلاً عکرمہ بن ابی جہل بہت عرصہ اسلام کے خلاف برسرکار رہے، بعد میں بہت اچھے مسلمان ہوئے، ان کی سابقہ باتوں کو بیان کرنا پھر مناسب نہ تھا لہذا اس طرح کے واقعات بھی ابن ہشام نے نکال دیئے۔ ۹۵۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کتاب میں کچھ اضافے بھی کیے یہ اضافے متن کے اندر ہیں لیکن 'قال ابن ہشام' سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کا اپنا بیان ہے اور یوں مغازی ابن اسحاق کا ایک تلخیص شدہ، نیا ورژن سامنے آیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ ابن اسحاق کی کتاب بھولنے لگے۔

سیرت ابن ہشام کے کئی مخطوطات ایشیا اور یورپ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مغرب میں بھی اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی سب سے پہلے وٹسن فیلڈ نے سیرت ابن ہشام کو ۱۸۵۸ء میں گوننگن (جرمنی) سے شائع کیا۔ وائل نے سیرت کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا ۱۹۶۱ء اس کے بعد اس کتاب کا اردو، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ الفریڈ گیام (A. Guillaume) جس نے سیرت ابن ہشام کا انگریزی ترجمہ کیا ہے وہ ابن ہشام کے اس کام کا بڑا معترف دکھائی دیتا ہے۔ یہ ترجمہ لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

ابو القاسم عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد سہیلی اندلسی (م ۵۸۱ھ) نے "الروض الانف" کے نام سے سیرت ابن ہشام کی بہترین اور ضخیم شرح لکھی اور ایک سو بیس سے زائد کتابوں کی مدد سے اس کو مکمل کیا۔ ۹۷۔

سیرت ابن ہشام کے مشکل الفاظ کی شرح ابو ذر مصعب بن محمد بن مسعود (م ۶۰۳ھ / ۱۰۶۷ء) نے لکھی جو چھپ چکی ہے۔

فتح بن موسیٰ المغربی (م ۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء) نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔

یوسف بن عبدالہادی (م ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء) نے اس کی شرح ”السیرہ فی حل مشکل السیرت“ کے عنوان سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہے۔ ۹۸۔ سیرہ ابن ہشام کی تلخیص بھی کی گئی۔

الف) احمد بن ابراہیم الواسطی (م ۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء) نے اس کا اختصار کیا جس کے قلمی نسخے لائیڈن، لندن اور استنبول میں ہیں۔

ب) الموید باللہ یحییٰ بن حمزہ بن علی (م ۷۴۷ھ / ۱۳۴۹ء) نے اس کی تلخیص ”خلاصۃ السیرۃ النبویۃ“ کے نام سے کی، قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ میں ہے۔

ج) محمد بن ابی بکر جماعہ (م ۸۱۹ھ / ۱۴۱۶ء) نے سیرت کا خلاصہ ”مختصرۃ السیرت“ کے نام سے لکھا، اس کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانہ تیمور پاشا میں ہے۔

د) عبدالسلام محمد ہارون نے اس کی تہذیب ”تہذیب سیرت ابن ہشام“ کے عنوان سے کی اور قاہرہ اور بیروت سے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۹۹۔

الغرض جس طرح ابن اسحاق کی کتاب المغازی پر صدیوں کام ہوتا رہا، اسی

طرح ابن ہشام کی سیرۃ پر بھی کئی جہتوں سے صدیوں کام ہوتا رہا

## ۲۱۔ علی بن محمد مدائنی: (م ۲۲۴ھ / ۸۳۹ء)

ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ ابوسیف مدائنی، سمرہ بن جندب یا ایک قول کے مطابق سمرہ بن حبیب بن عبدشمس بن عبدمناف کے غلام تھے۔ ۱۰۰ھ ان کی ولادت ۱۳۵ھ میں ہوئی، اصل وطن بصرہ ہے۔ مدائن میں مستقل سکونت اختیار کی پھر بغداد چلے گئے اور وہیں ۲۲۴ھ میں انتقال کیا۔ اپنے دور کے عظیم مورخ، ماہر انساب اور فتوحات کے زبردست عالم اور مصنف اور اشعار کے راوی تھے۔ ۱۰۱۔ ابوالعباس احمد بن یحییٰ کا قول ہے۔ ”جو شخص جاہلیت کے حالات معلوم کرنا چاہے وہ ابو عبیدہ کی کتابوں کو پڑھے اور جو شخص اسلامی دور کے حالات معلوم کرنا چاہے وہ مدائنی کی کتابوں کو پڑھے“۔ ۱۰۲۔

ان کے تلامذہ میں زبیر بن بکار، ۱۔ بن ابو خیشمہ بن احمد بن حارث خزازی، حارث بن ابو اسامہ، اور حسن بن علی بن متوکل وغیرہ ہیں۔ ابن الندیم نے تقریباً پانچ صفحات میں ان کی سینکڑوں تصانیف کے نام دیئے ہیں۔ مثلاً قریش کے حالات میں تیس کتابیں، شرفاء کے نکاح اور خواتین کے واقعات سے متعلق تیس کتابیں، خلفاء کے بارے میں سات کتابیں، اسلامی تاریخ کے مختلف وقائع و حوادث پر چھبیس کتابیں، اسلامی فتوحات پر سینتیس کتابیں، احوال عرب کے بارے میں دس کتابیں، واقعات شعراء کے باب میں بیس کتابیں، نیز متفرق موضوعات پر چھیالیس کتابوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی سیرت و مغازی، یا حیات طیبہ کے دیگر موضوعات سے متعلق ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔

۱. کتاب امہات النبی

۲. کتاب صفة النبی

۳. کتاب اخبار المنافقین

۴. کتاب عہود النبی

۵. کتاب تسمیة الذین یوذون النبی وتسمیة المستہذین الذین جعلوا القرآن

عضین

۶. کتاب رسائل النبی

۷. کتاب کتب النبی الی الملوک

۸. کتاب آیات النبی

۹. کتاب اقطاع النبی

۱۰. کتاب صلح النبی

۱۱. کتاب خطب النبی



- ۱۲ . کتاب المغازی  
 ۱۳ . کتاب سرايا النبي  
 ۱۴ . کتاب الوفود  
 ۱۵ . کتاب دعا النبي  
 ۱۶ . کتاب خبر الافک  
 ۱۷ . کتاب ازواج النبي  
 ۱۸ . کتاب السرايا  
 ۱۹ . کتاب عمال النبي علی الصدقات  
 ۲۰ . کتاب مانہی عنہ النبي، حجه ابی بکر الصديق  
 ۲۱ . کتاب الخاتم والرسول  
 ۲۲ . کتاب من کتب له النبي کتاباً و اماناً  
 ۲۳ . کتاب اموال النبي ۱۰۳

ان میں سے 'کتاب المغازی' کے بارے میں الندیم، ابوالحسن بن کوفی کا یہ بیان لکھتا ہے کہ یہ کتاب چمڑے کے آٹھ اجزاء میں عباس ناسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مدائنی کے پاس موجود تھی۔ اس نے اس کے نیچے اسی فصل میں اور دوسری جگہ اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ اس کے دو جز احمد بن حارث خزازی کی تصنیف ہیں۔ ۱۰۴

بہر حال ۲۳ کتابوں میں سے اگر ایک کتاب مدائنی کی نہ بھی ہو تو دیگر تصانیف سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سیرت رسول کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور وہ یقیناً اپنے وقت کے بہت بڑے مورخ، نسآب اور سیرت نگار تھے۔

## ۲۲۔ ابن عائد (م ۲۳۳ھ / ۸۴۷ء)

ابو عبد اللہ، محمد بن عائد بن احمد القرشی ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں دمشق میں پیدا

ہوئے اور ولید بن مسلم، یحییٰ بن حمزہ، اسمعیل بن عیاش وغیرہ سے حدیث کی روایت کی جبکہ ابو داؤد، ابو زرعہ وغیرہ ان کے راوی ہیں، وہ انشاء پرواز، مورخ اور ثقہ محدث ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ قدری تھے انہوں نے ۲۳۳ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ ۱۰۵

ابن سید الناس کی کتاب 'عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر، کا سب سے اہم اور سب سے بڑا ماخذ ابن عائد کی کتاب المغازی ہے۔ اس کے علاوہ ابن حجر عسقلانی کی "الاصابہ" میں اس کے بے شمار اقتباسات ہیں۔ ۱۰۶

### ۲۳۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر کوفی: (م ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء)

ابو عبدالرحمن محمد بن عبداللہ بن نمیر ہمدانی خارنی قبیلہ ہمدان کی شاخ بنو خارف سے تھے جو کوفہ میں آباد تھا، انہوں نے اپنے والد اور سفیان بن عیینہ، اسماعیل بن علیہ، عبداللہ بن ادریس اودی، حفص بن غیاث اور محمد ابن اسحاق سے روایت کی اور ان سے بخاری، مسلم، ابو داؤد اور ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کی۔ بڑے باوقار، علم و فہم، زہد و سنت اور فقر و استغناء کے جامع تھے۔ احمد ابن حنبل ان کو "درّۃ العراق" (عراق کا موتی) اور حسن بن سفیان "ریحانۃ العراق" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ۱۰۷ حدیث و فقہ کے ساتھ سیر و مغازی کے زبردست عالم تھے۔ ابن اسحاق کی "کتاب المبتداء والمبعث والمغازی" کے راوی تھے۔ ۱۰۸

### ۲۴۔ عبدالملک بن حبیب سلمی اندلسی (م ۲۳۸ھ / ۸۵۳ء)

ابو مروان عبدالملک بن حبیب بن سلیمان بن ہارون بن عباس بن مرداس، مالکی مسلک کے مشہور امام اور اندلس میں اس کے ناشر، تاریخ، اخبار، انساب، سیر اور مغازی اور عربیت کے زبردست عالم ہیں۔ ۱۰۹

مصر میں مغازی کے درس و روایت کا سلسلہ یتیم عروہ ابو الاسود نے عروہ بن

زیر کی کتاب المغازی سے شروع کیا اور وہاں کے اہل علم نے اس کتاب کی ان سے روایت کر کے اس کی یوں اشاعت کی کہ مغرب اقصیٰ اور اندلس تک اس کا فیض عام ہوا۔ مصر سے افریقہ اور اندلس تک امام مالک کے تلامذہ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور دیگر اسلامی علاقوں کی طرح یہاں بھی سیر و مغازی کا چرچا رہا اور اس میں کتابیں لکھی گئیں۔

عبدالملک بن حبیب نے اندلس میں تحصیل علم کے بعد ۲۰۸ھ میں مشرق کا سفر کیا اور یہاں کے اہل علم سے فیض یاب ہو کر ۲۱۰ھ میں اندلس واپس ہوئے اور البیرہ میں قیام کیا۔ امیر عبدالرحمن بن حکم نے ان کو قرطبہ بلا کر علمائے فقہ و فتویٰ کی جماعت میں شامل کیا۔ ۱۱۰ھ قاضی عیاض نے ان کی تصانیف میں مغازی سے متعلق ان دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب الرہون و المغازی والحدثان، یہ کتاب ۹۵ جزو میں تھی۔

۲۔ کتاب مغازی رسول ﷺ ۲۲ جزو میں تھی

جبکہ داودی نے طبقات المفسرین میں مغازی وغیرہ میں ان کی ان دو تصانیف

کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب الدہور والقدماء والحدثان، اس کتاب نے ۹۵ جزو ہیں

۲۔ کتاب مغازی رسول، ۲۲ جزو ہیں۔ ۱۱۱

## ۲۵۔ حسن بن عثمان زیادی بغدادی: (م ۲۲۳ھ / ۸۵۷ء)

ابو حسان حسن بن عثمان بن حماد بن عبدالرحمن بن یزید زیادی، واقدی کے تلامذہ کبار میں سے ہیں، نہایت ثقہ اور متقی عالم اور بغداد کے مشرقی علاقہ کے قاضی تھے۔ اس کے ساتھ سیر و مغازی اور تواریخ و اخبار کے مشہور عالم تھے۔ انہوں نے واقدی، ابراہیم بن سعد، ہشیم بن بشیر، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم سے روایت کی ہے اور یہ

سب کے سب سیر و مغازی کے امام و مصنف ہیں نیز دوسرے آئمہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ ۱۱۲

حسن بن عثمان علم تاریخ کی افادیت کے قائل تھے، کہ اس کی وجہ سے راویوں کا صدق اور کذب کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ ساٹھ سال تک اس علم سے وابستہ رہے۔ ۱۱۳

ابن الندیم کا بیان ہے کہ وہ قاضی، فاضل، ادیب ماہر انساب، سخی اور شریف الطبع عالم تھے، وہ خود کتابیں لکھتے تھے اور ان کے لیے کتابیں لکھی جاتی تھیں اور ان کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ ۱۱۴ ابن الندیم نے ان کی ایک کتاب کا نام 'معانی عروہ بن زبیر' لکھا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری کا کہنا ہے کہ ابو حسان زیادہ کی کتاب کا نام معانی عروہ بن زبیر مصری نسخہ میں نسخ یا طباعت کی غلطی ہے یہ مغازی عروہ بن زبیر ہے، جیسا کہ بعض معاصر فضلاء نے الفہرست، مطبوعہ یورپ کے صفحہ ۱۲۳ سے یہی نام درج کیا ہے۔ ۱۱۵

ابو حسان زیادہ نے عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کو مرتب اور مدون کیا تھا اور اس کا شمار ان کی تصانیف میں ہوتا تھا۔ ابن الندیم کے مطابق ان کی وفات ۲۴۳ھ میں بعمر ۷۸ ہوئی۔ ۱۱۶

## ۲۶۔ احمد بن حارث خزازی:

ابو جعفر احمد بن حارث بن مبارک خزازی، خلیفہ ابو جعفر المنصور کے مولیٰ تھے اور ابوالحسن مدائنی کے شاگرد خاص تھے اور ان کی تصانیف کے راوی تھے اور وہ صدوق اور صاحب فہم و معرفت عالم تھے۔ ۱۱۷ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں "کتاب المغازی و سراہاہ و ذکر ازواجہ" کا ذکر کیا ہے۔ ۱۱۸ قاضی اطہر مبارک پوری اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ غالباً یہ کتاب ابوالحسن مدائنی کی کتاب المغازی۔ کتاب ازواج النبیؐ اور کتاب السرایا کا مجموعہ ہے جن کو احمد بن حارث خزازی نے ان سے روایت کر کے قدامت کے

طریقہ پر ان میں اضافہ کیا ہے اس لیے ان کی طرف منسوب ہوئی۔ ۱۱۹

## ۲۷۔ حماد بن اسحاق: (م ۲۶۷ھ / ۸۶۱ء)

ابو اسماعیل حماد بن اسحاق بن اسماعیل الازدی ۱۹۹ھ / ۸۱۵ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ساری زندگی بغداد میں گذاری جہاں وہ عہدہ قضاء پر فائز تھے، مالکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور سوس (الاهواز) میں ۲۶۷ھ / ۸۶۱ء میں وفات پائی۔ سیرۃ کے حوالے سے ان کی ایک تصنیف ”ترکۃ النبی“ ہے اس کے راوی حماد بن اسحاق کے بیٹے ابو اسحاق ابراہیم بن حماد ہیں۔ کتاب کے چند اوراق کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں ۱۲۰ تاہم ابن الندیم اس کتاب کا تذکرہ نہیں کرتا۔ ۱۲۱

## ۲۸۔ ابو ذرعہ: (م ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء)

ابو ذرعہ عبدالرحمن بن عمرو بن عبداللہ دمشقی کی دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے  
۱۔ سیرۃ النبی و تاریخ خلفاء الراشدین۔ اس کتاب کے ایک سو پچاس اوراق کتاب خانہ الفتح (استنبول) میں ہیں۔  
۲۔ الاحادیث والحکایات والعلل والسوالات: اس کتاب کے چند اوراق کتاب خانہ الظاہریہ، دمشق میں ہیں۔

ابو ذرعہ نے ۲۸۰ھ میں دمشق میں انتقال کیا۔ ۱۲۲

## ۲۹۔ اسماعیل بن اسحاق: (م ۲۸۲ھ / ۸۹۵ء)

ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق بن حماد بن زید بن درہم ازدی ۲۰۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، یہ آل جریر کے مولیٰ تھے، ان کا خاندان کئی صدیوں تک علم دین، قضاء، فقہ، حدیث کے ساتھ دنیاوی جاہ و جلال میں ممتاز رہا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق بصرہ میں ہی پروان چڑھے لیکن بعد میں بغداد کو اپنا وطن بنا لیا اور وہاں کے مختلف علاقوں میں قاضی

رہے۔ ۱۲۳۔ مالکی مسلک کے امام و ناشر تھے، ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب المغازی ۱۲۴ کی تصریح کی ہے ان کی دیگر تصانیف میں کتاب احکام القرآن، کتاب احوال القيامة، کتاب المہبوط، کتاب حجاج القرآن، کتاب شواہد الموطاء، اور کتاب الرد علی محمد بن الحسن شامل ہیں۔ ۱۲۵۔

### ۳۰۔ ابراہیم بن محمد بن سعید کوفی (م ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء)

ابراہیم بن محمد بن سعید بن ہلال ثقفی نے اسماعیل بن ابان، ابو نعیم، عباد بن یعقوب اور عباس بن بکار وغیرہ سے روایت کی اور ان سے احمد بن علی، حسین بن علی بن محمد زعفرانی، محمد بن یزید رطال وغیرہ نے روایت کی۔ ابو نعیم نے تاریخ اصفہان میں ان کو غالی رافضی بتایا ہے، اس لیے ان کے بھائی نے ترک تعلق کر لیا تھا۔ انہوں نے ایک کتاب ”المناقب والمثالب“ لکھی، لوگوں نے کہا کہ تم اس کتاب کو ظاہر کرو، انہوں نے پوچھا کون سا شہر شیعیت میں غلو رکھتا ہے، لوگوں نے اصفہان کا نام لیا، انہوں نے اس کتاب کی روایت اصفہان میں کی۔ شمس الدین محمد بن علی داودی مصری نے طبقات المفسرین میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی تصانیف میں پہلا نام کتاب المغازی کا لکھا ہے۔ ۱۲۶۔

### ۳۱۔ ابراہیم بن اسحاق: (م ۲۸۵ھ / ۸۹۸ء)

ابو اسحاق ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم بن بشیر بن عبداللہ کا خاندان خراسان کے شہر مرو کا تھا۔ بعد میں بغداد آکر باب الحرب کے پاس آباد ہو گیا۔ امام حربی یہیں ۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تیس سال کی عمر میں امام احمد بن حنبل کے حلقہ درس میں گئے تو ان کی وفات (یعنی ۲۴۱ھ) تک وہیں رہے۔ حربی نے اپنے زمانے کے آئمہ علم سے حدیث، فقہ، نحو، ادب، تاریخ، اخبار، سیر و مغازی کا علم حاصل کیا۔ ایک اندازے کے

مطابق ان کے استادوں میں ۲۰۵ محدثین، اور ۲۶ مورخین ہیں، زہد و تقویٰ اور اخفائے حال میں بہت آگے تھے۔ ان کے مکان کے بیرونی حصہ میں ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں بیٹھ کر لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ زندگی بڑی تنگ دستی میں گذاری لیکن خلفاء کے نذرانے قبول نہیں کرتے تھے۔ ۱۲۷ھ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے ۱۲۸ھ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں صرف دو کتابیں بچ سکی ہیں۔ ایک اکرام الضیف، یہ کتاب ۱۳۲۹ھ میں قاہرہ سے چھپی ہے، دوسری کتاب المناسک و معالم طرق الحج و معالم الجزیرہ، کے نام سے ۱۳۸۹ھ میں مورخ الجزیرہ استاد احمد الجاسر نے شائع کی ہے۔

### ۳۲۔ محمد بن یحییٰ مروزی:

ابو بکر محمد بن یحییٰ بن سلیمان بن زیاد و راق کا وطن خراسان کا شہر مرو تھا، بعد میں بغداد کو وطن بنایا اور یہیں فوت ہوئے۔ انہوں نے ابو عبید قاسم بن سلام، عثمان بن ابی شیبہ، داود بن عمرو ضعی، سعید بن سلیمان واسطی، علی بن جعد، حکم بن موسیٰ، محمد بن جعفر ورکانی سے روایت کی، کثیر الحدیث اور ثقہ محدث تھے۔ ان کے پاس ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب الطہارت کے کچھ اجزاء تھے۔ جن کی روایت کرتے تھے جاحظ کے وراق، یعنی اس کی کتابوں کے ناقل اور راوی تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب المغازی ہے، جس کی روایت کرتے تھے۔ اس کتاب کا پتہ ان کے شاگرد مخلص بن جعفر، ابو علی دقاق فارسی باقرجی (م ۳۷۰ھ) کے حال سے پتہ چلتا ہے۔ ۱۲۹ھ

## حاصل بحث

الغرض رسول اللہ کی سیرت اور احکامات کی تفصیلات کو محفوظ کرنے کی غرض سے محدثین نے سیر و مغازی کی تدوین کا کام مدینہ منورہ سے شروع کیا۔ یہ ”مدنی اسکول“ جو مسلسل تین نسلوں کی مربوط اور انتھک کوششوں سے وجود میں آیا تھا۔ سیرت نگاری کا دبستان اول تھا۔ یہاں کے ابتدائی سیرت نگاروں نے اس فن کو محدثین کے طریقہ کار کے مطابق اسناد کی رعایت کرتے ہوئے پروان چڑھایا اور سیرت کے خدوخال متعین کیے۔

عہد خلافت راشدہ میں تکثیر روایت سے روکا گیا تھا تاکہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر حدیث کی طرف نہ جھک جائیں، لیکن غزوات و سزایا کے بیان کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے گئے، چنانچہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں سیر و مغازی کا تذکرہ مسلمانوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ یوں مدینہ میں اس حوالے سے ایسی فضا بن گئی تھی جس نے تدوین سیر و مغازی کے لیے راہ ہموار کی اور سیرت کی اہم کتابیں تحریر کی گئیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مدینہ منورہ کے ابتدائی سیرت نگاروں نے اپنے احوال و ظروف کے مطابق اپنی کتابیں تالیف کیں اس میں کسی خلیفہ یا امیر کے حکم یا خواہش کو دخل نہیں تھا جیسا کہ شبلی نعمانی کا خیال ہے (یہ بحث باب سوئم، فصل دوئم میں گزر چکی ہے)۔

سیرت پر لکھی جانے والی ابتدائی دو کتابیں ’کتاب المغازی‘ کے نام سے مشہور ہوئیں، تاہم تیسری کتاب جو ابن شہاب زہری کی تھی، اسے انہوں نے ”سیرة“ کا نام دیا۔ اور اس نام کے انہوں نے اصطلاحی معنوں میں استعمال کرتے ہوئے سیرت نگاری کے فن کو متعین شکل و صورت اور واضح دائرہ کار عطا کیا، جس پر ان کے بعد آنے والے مورخین نے عمل کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن شہاب زہری نے فن تاریخ میں



واقعات نگاری کے ایک نئے اسلوب کو جنم دیا بلکہ حقیقتاً انہوں نے سیرت کے اسکول کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں قائدانہ کردار انجام دیا۔

تین نسلوں کے بعد سیرت نگاری کا یہ سلسلہ مدینہ سے باہر بھی پھیلنے لگا اور بصرہ، کوفہ، یمن میں سیرت کی ابتدائی کتابیں لکھی جانے لگیں جبکہ مدینہ میں بدستور سیرت نگاری پر کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد ابن اسحاق کی کتاب المبتداء والمبعث والمغازی سے سیرت نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ فنی اعتبار سے سیرت نگاری کے خدوخال زیادہ واضح ہونے لگے۔ یہ کتاب مدتوں سیرت نگاران رسول کے لیے مشعل راہ بنی رہی۔ دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسویں میں تاریخ نگاری کا دائرہ وسیع ہوا۔ سیرت و مغازی کے علی الرغم دوسرے موضوعات پر بھی تصانیف سامنے آنے لگیں۔ علم الانساب، تاریخ بنو امیہ، تاریخ یمن اور تاریخ تہذیب اسلامی کے گونا گوں پہلوؤں پر بھی لکھا جانے لگا، لیکن سیرت نگاری کا سفر چلتا رہا۔ دوسری صدی ہجری میں کم از کم بتیس سیرت نگار ایسے تھے جن کے بارے تفصیلات دستیاب ہو سکیں اور ان کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر کی کتابیں ضائع ہو گئیں لیکن جو کچھ دست برد زمانہ سے محفوظ رہا اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس صدی میں سیرت پر لکھی جانے والی نمائندہ تصانیف اس فنی سفر کے ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں جو فن سیرت نگاری کے حوالے سے رونما ہوا۔

تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسویں میں سیرت کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ جملہ علوم اسلامیہ کے حوالے سے عروج کی صدی ہے۔ اس صدی میں علمائے اسلام نے جس موضوع پر جو کچھ لکھا وہی بعد میں علماء اور مصنفین کا سرمایہ علم و فن ٹہرا۔ حدیث کے حوالے سے دیکھیں تو 'صحاح' لکھی جا چکی تھیں۔ فقہ کے حوالے سے دیکھیں تو اہم فقہی کتب، جن پر مسالک فقہ کی بنیاد تھی، لکھی جا چکی تھی۔ یہی حال سیر و مغازی کا بھی

تھا۔ متقدمین کی کتب لکھی جا چکی تھیں۔ بعد میں انہی کتب کی تہذیب کی گئی، ان میں ترامم اور اضافے کئے گئے، ان کی شرحیں لکھی گئیں، کہیں اجمال کی تشریح کی گئی کہیں تفصیل کی تلخیص کی گئی۔ الغرض تیسری صدی ہجری میں یہ فن تصنیفی اعتبار سے مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مسلمان مورخین نے عالمی تاریخیں لکھنی شروع کیں، اور سیرت ان کی تاریخ کا ایک جزو یا حصہ بن گیا۔ مثلاً تاریخ طبری، تاریخ مسعودی اور تاریخ یعقوبی وغیرہ میں سیرت رسول اللہ کا حصہ، عالمی تاریخ کے ایک جزو کے طور پر شامل ہے۔ یہ صورت حال تقریباً دو سو سال تک برقرار رہی، اس کے بعد ایک بار پھر مورخین نے سیرت نبوی پر علیحدہ تصانیف کا سلسلہ شروع کیا، ایسے میں ان کا ماخذ قرآن و حدیث کے علاوہ متقدمین سیرت نگاروں کی تصانیف ہی تھیں۔ تاہم سیرت نگاری کا یہ دور اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

## حواشی و حوالہ جات (باب ششم)

- ۱۔ ابن الندیم کے مطابق یہ اہل کوفہ سے تھے۔ الفہرست، ص ۱۲۳۔
- ۲۔ طبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۵۳۶۔
- ۳۔ طبقات الکبریٰ جلد ۵، ص ۵۳۵۔
- ۴۔ جوزف ہورودتس بحولہ ابن حجر تہذیب التہذیب۔
- ۵۔ الفہرست، ص ۱۲۳۔
- ۶۔ فواد سیزگین، ص ۱۶۸۔
- ۷۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۷۹۔
- ۸۔ فواد سیزگین، ص ۱۶۹۔
- ۹۔ جوزف ہورودتس، ص ۷۵۷۔
- ۱۰۔ ایضاً۔
- ۱۱۔ ایضاً۔
- ۱۲۔ ایضاً۔
- ۱۳۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۲۸۔
- ۱۴۔ فواد سیزگین، ص ۱۶۹۔
- ۱۵۔ ایضاً۔
- ۱۶۔ دیکھئے اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۲۸۔
- ۱۷۔ مکاتب وہ غلام ہوتا تھا جو رقم ادا کر کے آزادی حاصل کر لے۔
- ۱۸۔ ابن قتیبہ 'المعارف'، ص ۲۲۰۔
- ۱۹۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۱۹۳۔
- ۲۰۔ ایضاً۔

- ۲۱۔ ایضاً۔
- ۲۲۔ ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۷، ص ۴۱۸۔
- ۲۳۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۰۔
- ۲۴۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۱۴۔
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔
- ۲۶۔ ابن الندیم، الفہرست میں ابو معشر کی کتاب المغازی کا تذکرہ کرتے ہیں، دیکھئے، ص ۱۲۲۔
- ۲۷۔ خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۱۳، ص ۴۲۸۔
- ۲۸۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۰۔
- ۲۹۔ ایضاً۔
- ۳۰۔ جوزف ہوروتس، سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین، ص ۷۶۹۔
- ۳۱۔ ابن سعد 'طبقات الکبریٰ' جلد ۵، ص ۴۲۰۔
- ۳۲۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۱۶۔
- ۳۳۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔
- ۳۴۔ شبلی نعمانی 'سیرۃ النبی' مقدمہ جلد ۱، ص ۳۱۔
- ۳۵۔ کتاب الفہرست، ص ۲۷۸۔
- ۳۶۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۱۸۔
- ۳۷۔ تاریخ بغداد، جلد ۱۰، ص ۱۰-۴۰۹۔
- ۳۸۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۶۸۔
- ۳۹۔ ایضاً۔
- ۴۰۔ تاریخ بغداد، جلد ۱۲، ص ۱۰۶۔

۴۱۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۶۹۔

۴۲۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی (مقدمہ) جلد ۱، ص ۳۱۔

۴۳۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۳۸

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۲۱۔

۴۷۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۱۹۔

۴۸۔ تاریخ بغداد، جلد ۶، ص ۸۳

۴۹۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۵۶۔

۵۰۔ کوفہ اور بصرہ کے درمیان اموی دور خلافت میں شہر واسط کی تعمیر و تاسیس ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوفہ و بصرہ کا یہ سنگم علم و علماء کا مرکز بن گیا اور یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔

۵۱۔ ان کی حدیث کے بارے میں علماء کی رائے جاننے کے لیے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ، ص ۲۰۲۔

۵۲۔ الفہرست، ص ۲۸۰۔

۵۳۔ مصیصۃ سرحد شام پر انطاکیہ اور بلاد روم کے درمیان دریائے جیحان کے کنارے آباد تھا، کہتے ہیں اسے مصیصہ بن روم بن یمن بن ساتم بن نوح نے تعمیر کیا تھا۔ دمشق کے قریب ایک گاؤں کا نام بھی مصیصہ ہے (معجم البلدان)۔

۵۴۔ مزید حالات زندگی کے لیے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۲۱۷۔

۵۵۔ الفہرست، ص ۱۲۱۔

۵۶۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۱۔

- ۵۷۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، جلد ۷، ص ۳۸۱۔
- ۵۸۔ اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۲۷۰۔
- ۵۹۔ ایضاً۔
- ۶۰۔ ایضاً۔
- ۶۱۔ اطہر مبارک پوری نے ان کا سنہ وفات غلطی سے ۲۹۱ھ لکھ دیا ہے، جو ممکن نہیں۔  
ہوسکتا ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ دیکھئے اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۷۰ تا ۲۷۱۔
- ۶۲۔ ابن خطیب 'تاریخ بغداد'، جلد ۱، ص ۲۲۱۔
- ۶۳۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۷۳ تا ۲۷۴۔
- ۶۴۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۲۔
- ۶۵۔ ذہبی 'تذکرہ الحفاظ'، جلد ۱، ص ۲۵۱۔
- ۶۶۔ اطہر مبارک پوری 'تدوین سیر و مغازی'، ص ۲۳۹۔
- ۶۷۔ تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، ص ۲۵۱، نیز طبقات الکبریٰ، جلد ۶، ص ۳۹۸۔
- ۶۸۔ ایضاً۔
- ۶۹۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۲۔
- ۷۰۔ ان کے ایک بھائی عبدالملک بن سعید تھے وہ ادیب، علم النجوم کے ماہر اور مورخ تھے  
(دیکھئے ابن سعد، طبقات الکبریٰ، جلد ۶، ص ۳۹۸)
- ۷۱۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۲۔
- ۷۲۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۸۲۔
- ۷۳۔ الفہرست، ص ۱۳۹۔
- ۷۴۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۲۳۶۔

۷۵۔ تدوین سیرومغازی، ص ۲۸۷۔

۷۶۔ ایضاً۔

۷۷۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۴۰۔

۷۸۔ ذہبی، تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، ص ۲۵۲، نیز ابن سعد، طبقات الکبریٰ جلد ۶، ص ۳۹۹

۷۹۔ ذہبی، تذکرہ الحفاظ، ص ۲۵۲۔

۸۰۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۴۵۔

۸۱۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۳۔

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۷۴۔

۸۳۔ ایضاً۔

۸۴۔ ایضاً۔

۸۵۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۲۷۹۔

۸۶۔ تدوین سیرومغازی، ص ۲۸۰۔

۸۷۔ ایضاً۔

۸۸۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۲۷۹۔

۸۹۔ تذکرہ الحفاظ جلد ۱، ص ۲۷۹ و تدوین سیرومغازی، ص ۲۸۰۔

۹۰۔ الفہرست، ص ۲۷۹۔

۹۱۔ تدوین سیرومغازی، ص ۲۸۱۔

۹۲۔ ابو عبیدہ نے اعجاز القرآن اور قرآن کے غرائب اور مشکل الفاظ پر کئی کتابیں لکھی

تھیں۔ ابو عبیدہ کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ امام بخاری نے ان کی کتاب کا بیشتر حصہ اپنی

کتاب صحیح بخاری میں شامل کر لیا ہے۔ امام بخاری جہاں کسی حدیث میں موجود مشکل لفظ

کے معنی بیان کرتے ہیں یا کسی آیت کی لغوی یا لسانی تشریح کرتے ہیں تو ابو عبیدہ کی

کتاب کا حوالہ دیتے ہیں (محمود احمد غازی 'محاضرات سیرت'، ص ۲۸۱)۔

۹۳۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۴۷۔

۹۴۔ ابن خلکان 'وفیات الاعیان' جلد ۱، ص ۳۱۵۔

۹۵۔ محاضرات سیرت، ص ۱۸۰۔

۹۶۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۸۔

۹۷۔ اطہر مبارک پوری، ص ۲۴۸۔

۹۸۔ فواد سیزگین، ص ۱۷۸۔

۹۹۔ ایضاً۔

۱۰۰۔ الفہرست، ص ۱۳۰۔

۱۰۱۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۴۰۔

۱۰۲۔ ابن خطیب بغدادی 'تاریخ بغداد' جلد ۱۴، ص ۵۴۔

۱۰۳۔ الفہرست، ص ۱۳۰ تا ۱۳۷۔

۱۰۴۔ ایضاً۔

۱۰۵۔ فواد سیزگین، ص ۱۸۱۔

۱۰۶۔ ایضاً۔

۱۰۷۔ ذہبی 'تذکرہ الحفاظ'، جلد ۲، ص ۳۲۹۔

۱۰۸۔ اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، ص ۲۴۳۔

۱۰۹۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۸۸۔

۱۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۱۔ ایضاً۔

۱۱۲۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۵۸۔



۱۱۳۔ تاریخ بغداد، جلد ۷، ص ۳۵۶۔

۱۱۴۔ الفہرست، ص ۱۴۰۔

۱۱۵۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۵۹۔

۱۱۶۔ الفہرست، ص ۱۴۰۔

۱۱۷۔ ابن خطیب، تاریخ بغداد، جلد ۴، ص ۱۲۲۔

۱۱۸۔ الفہرست، ص ۱۳۴۔

۱۱۹۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۶۰۔

۱۲۰۔ فواد سیزگین، ۱۸۱۔

۱۲۱۔ الفہرست، ۱۷۶۔

۱۲۲۔ فواد سیزگین، ص ۱۸۱-۱۸۲۔

۱۲۳۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۵۱۔

۱۲۴۔ قاضی عیاض اور داودی نے اس کتاب کا نام ”کتاب الاحوال و المغازی“ بیان کیا

ہے۔

۱۲۵۔ الفہرست، ص ۲۴۸۔

۱۲۶۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۴۲۔

۱۲۷۔ ابن خطیب بغدادی نے اس حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حربی بیمار پڑے ان کے دوست ابوالقاسم جبلی عیادت کو گئے، حربی نے ان سے کہا مجھے اپنی بیٹی کی طرف سے پریشانی ہے۔ اس کے بعد بیٹی کو بلایا وہ چہرہ پر نقاب ڈال کر آئی اور کہنے لگی ہم لوگ سخت تنگی میں ہیں، مہینوں سوکھی روٹی اور نمک تک میسر نہیں ہوتا۔ کل خلیفہ معتضد نے ایک ہزار دینار بھجوائے تھے مگر والد نے قبول نہیں کئے۔ اسی طرح دوسروں نے رقم بھیجی مگر واپس کر دی۔ والد بیمار ہیں اور گھر کا یہ حال ہے۔ لڑکی کی باتیں سن کر امام حربی

نے مسکراتے ہوئے کہا کہ تم گھر کے اس کونے میں دیکھو یہاں بارہ ہزار اجزاء ہیں جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ میرے انتقال کے بعد تم روز آ نہ ایک جزو ایک درہم میں فروخت کرنا، جس کے پاس بارہ ہزار درہم ہوں وہ فقیر نہیں ہے (تاریخ بغداد جلد ۶، ص ۲۲)۔

۱۲۸۔ ابن الندیم ”الفہرست“۔

۱۲۹۔ تدوین سیر و مغازی، ص ۲۶۱۔

## سیرت نگاران نبوی

علامہ شبلی نعمانی نے تیسری صدی ہجری تک کے اکتیس سیرت نگاروں کی ایک نامکمل فہرست، سیرۃ النبی کے مقدمے میں دی ہے۔ ذیل کے چارٹ کی مدد سے اس فہرست کو کافی حد تک مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اس فہرست کے حتمی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فہرست سنہ وفات کے اعتبار سے بنائی گئی ہے۔

سیرت نگار	سنہ وفات	جائے پیدائش / جائے وفات	سیرت پر تصانیف
دوراؤل			
۱۔ سہل بن ابی حمزہ	۵۳۱ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۲۔ عروہ بن زبیر بن العوام	۵۹۴ھ	مدینہ / مدینہ	مغازی رسول اللہ
۳۔ أبان بن عثمان بن عفان	۱۰۵ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۴۔ محمد ابن شہاب زہری	۱۲۴ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۵۔ سعید بن سعد بن عبادہ		مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۶۔ سعید ابن مسیب	۵۹۴ھ	مدینہ / مدینہ	مغازی، فتوح اور سیرت پر آپ کی کتاب موجود تھی

- |     |                                 |      |                                   |                                                  |
|-----|---------------------------------|------|-----------------------------------|--------------------------------------------------|
| ۷۔  | عبداللہ ابن کعب<br>انصاری       | ۵۹۷  | مدینہ / مدینہ                     | مغازی پر ایک مختصر<br>کتاب کے مولف تھے           |
| ۸۔  | عامر بن شراحیل شعبی             | ۵۱۰۳ | کوفہ / کوفہ                       | کتاب الفتوح، کتاب<br>المغازی                     |
| ۹۔  | قاسم بن محمد بن ابی بکر<br>صدیق | ۵۱۰۷ | مدینہ /<br>قدید (مدینہ<br>کے قریب | سیر و مغازی پر ایک<br>کتاب مرتب کی تھی           |
| ۱۰۔ | وہب بن منبہ                     | ۵۱۱۰ | صنعاء / صنعاء<br>(یمن)            | کتاب المغازی /<br>کتاب المبتداء                  |
| ۱۱۔ | عاصم بن عمر بن قتادہ            | ۵۱۲۰ | مدینہ / مدینہ                     | سیرت کے مختلف<br>موضوعات پر ان کی<br>کتابیں تھیں |
| ۱۲۔ | جعفر بن محمود انصاری            |      | مدینہ / مدینہ                     | کتاب الغزوة لکھی                                 |
| ۱۳۔ | شرحبیل بن سعد                   | ۵۱۲۳ | مدینہ / مدینہ                     | فن مغازی پر ایک<br>کتاب لکھی                     |
| ۱۴۔ | عمرو بن عبداللہ السبعی          | ۵۱۲۷ | کوفہ / کوفہ                       | سیرت اور مغازی پر<br>ایک سے زائد کتب<br>کے مولف  |
| ۱۵۔ | یعقوب بن عتبہ                   | ۵۱۲۸ | مدینہ / مدینہ                     | سیرت پر ان کی تحریریں<br>تھیں                    |

۱۶۔	عبداللہ بن ابی بکر	۱۳۰ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی کے مؤلف ہیں
۱۷۔	یزید بن رومان	۱۳۰ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۱۸۔	ابوالاسود یتیم عروہ	۱۳۷ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۱۹۔	داؤد بن الحسین	۱۳۵ھ	مدینہ / مدینہ	حیات النبی اور صحابہ کرام کے حالات جمع کیے
۲۰۔	موسیٰ بن عقبہ	۱۴۱ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی
۲۱۔	ابوالمعتمر سلیمان بن طرخان	۱۴۳ھ	بصرہ / بصرہ	کتاب المغازی
دورِ ثانی				
۲۲۔	محمد بن اسحاق	۱۵۱ھ	مدینہ / بغداد	(۱) کتاب المبتداء والمبعث والمغازی، (۲) حدیث اسراء والمعراج
۲۳۔	معمربن راشد	۱۵۴ھ	بصرہ / صنعاء (یمن)	کتاب المغازی
۲۴۔	عبدالرحمن بن عبدالعزیز حنفی	۱۶۲ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب السیرة
۲۵۔	ابومعشر سندی	۱۷۰ھ	یمن / بغداد	کتاب المغازی
۲۶۔	سلیمان بن بلال تیمی	۱۷۲ھ	مدینہ / مدینہ	کتاب المغازی

- ۲۷۔ عبدالمملک بن محمد بن ابوبکر  
 ۱۷۶ھ مدینہ / بغداد کتاب المغازی
- ۲۸۔ علی بن مجاہد کابلی  
 ۱۸۲ھ ----- کتاب المغازی
- ۲۹۔ زیاد بن عبداللہ بکائی  
 ۱۸۳ھ مدینہ / کوفہ کتاب المغازی
- ۳۰۔ ابراہیم بن سعد بن ابراہیم  
 ۱۸۳ھ مدینہ / بغداد کتاب المغازی
- ۳۱۔ ہشیم بن بشیر واسطی  
 ۱۸۳ھ واسط / بغداد کتاب المغازی
- ۳۲۔ ابواسحاق ابراہیم بن محمد الفزاری  
 ۱۸۸ھ کوفہ / مصیصہ کتاب السیر فی  
 (شام) الاخبار والاحداث
- ۳۳۔ سلمہ بن الفضل ابرش  
 ۱۹۱ھ مدینہ / کتاب المغازی
- ۳۴۔ محمد بن سلمہ بابلی حرانی  
 ۱۹۱ھ حران / حران کتاب المغازی
- ۳۵۔ یحییٰ بن سعید اموی  
 ۱۹۴ھ کوفہ / بغداد کتاب المغازی
- ۳۶۔ ابوالعباس اموی  
 ۱۹۵ھ دمشق / انہوں نے ۷۰ کتابیں  
 تالیف کیں ان میں  
 ایک کتاب المغازی تھی
- ۳۷۔ ولید بن مسلم قرشی  
 ۱۹۵ھ دمشق / دمشق کتاب المغازی سمیت  
 متعدد کتابوں کے  
 مصنف
- ۳۸۔ عبداللہ بن وہب  
 ۱۹۷ھ مصر / مصر تصانیف کثیرہ کے  
 مصنف، اسی میں کتاب  
 المغازی شامل تھی

۳۹۔	یونس بن بکیر	۵۱۹۹	کوفہ / کوفہ	کتاب المغازی
۴۰۔	ابو حذیفہ	۵۲۰۶	بلخ / بخارا	کتاب المبتداء
۴۱۔	محمد بن عمر بن واقد الواقدی	۵۲۰۷	مدینہ / بغداد	سیرت پر چار کتابوں کے مصنف (۱) کتاب التاریخ والمغازی والمبعث (۲) کتاب السیرة (۳) کتاب ازواج النبی (۴) کتاب وفاة النبی
۴۲۔	عبدالرزاق بن ہمام بن نافع	۵۲۱۱	صنعاء / صنعاء	کتاب المغازی
۴۳۔	عبدالملک بن ہشام حمیری	۵۲۱۸	بصرہ / مصر	سیرة ابن ہشام
۴۴۔	علی بن محمد مدائنی	۵۲۲۲	بصرہ / بغداد	یہ ۲۳۴ کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے تیس کتابیں سیرت پر تھیں
۴۵۔	محمد ابن سعد (کاتب الواقدی)	۵۱۳۰	بصرہ / بغداد	(۱) طبقات الکبریٰ (۲) اخبار النبی
۴۶۔	ابن عائد	۵۲۳۳	دمشق / دمشق	کتاب المغازی
۴۷۔	محمد بن عبداللہ بن نمیر کوفی	۵۲۳۳	کوفہ / کوفہ	کتاب المغازی

- ۴۸۔ عبد الملک بن حبیب سلمی ۲۳۸ھ اندلس (۱) کتاب الرہون والمغازی والحدثان (۲) کتاب مغازی رسول
- ۴۹۔ حسن بن عثمان زیادی ۲۴۳ھ / بغداد کتاب المغازی
- ۵۰۔ احمد بن حارث خزار کتاب المغازی والسرائیا و ذکر ازوجہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخیں لکھیں جن میں سیرت کا بھی ذکر ہے
- ۵۱۔ عمر بن شبہ البصری ۲۶۲ھ بصرہ / بصرہ
- ۵۲۔ حماد بن اسحاق ۲۶۷ھ بصرہ / سوس (اہواز) ترکۃ النبی
- ۵۳۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی ۲۷۹ھ کتاب الشمائل
- ۵۴۔ ابو ذر ۲۸۰ھ دمشق / دمشق سیرۃ النبی و تاریخ خلفاء الرشیدین
- ۵۵۔ اسماعیل بن اسحاق ۲۸۲ھ بصرہ / بغداد کتاب المغازی (اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر چھ اور کتابوں کے مصنف تھے)
- ۵۶۔ ابراہیم بن محمد بن سعید ۲۸۳ھ کوفہ / کوفہ کتاب المغازی



- ۵۷۔ ابراہیم بن اسحاق حربی ۲۸۵ھ بغداد، بغداد کتاب المغازی (اس کے علاوہ متعدد کتابوں کے مولف تھے)
- ۵۸۔ محمد بن یحییٰ مروزی مرو (خراسان) کتاب المغازی بغداد
- ۵۹۔ ابو بکر احمد بن ابی خیثمہ ۲۹۹ھ بغداد، بغداد تاریخ کبیر (اس میں سیرت نبوی کا حصہ شامل ہے) بغدادی

## کتابیات

### عربی کتب:

- ۱- آلوسی، محمود، شکری بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب مطابع دارالکتاب القربی، مصر، الطبعة الثالثة ۱۳۳۲ھ
- ۲- ابن اثیر جزری، ابو الحسن علی بن محمد اسد الغابة فی معرفة الصحابة قاہرہ، ۱۹۷۰ء
- ۳- ابن شیر جزری الکامل فی التاريخ دارصادر، بیروت ۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء
- ۴- ابن الندیم الفہرست دارالمعرفة، بیروت، لبنان ۱۳۱۵ھ / ۱۹۹۵ء
- ۵- ابن حجر عسقلانی، شہاب الدین تہذیب التہذیب دائرہ المعارف النظامیہ، حیورآباد، دکن ۱۳۲۵ھ
- ۶- ابن حجر عسقلانی فتح الباری سلفیہ، قاہرہ (تن) دارالمعارف، مصر ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء
- ۷- ابن حزم الاندلسی، علی بن احمد جمهرة انساب العرب دارالمعارف، مصر ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء
- ۸- ابن خلکان وفيات الاعیان و ابناء الزمان مکتبہ النهضة المصریہ، قاہرہ، ۱۹۳۸ء
- ۹- ابن سعد طبقات الکبریٰ دارصادر، بیروت، ۱۳۰۵ھ / ۱۹۸۵ء

- |                         |                                      |                                                        |
|-------------------------|--------------------------------------|--------------------------------------------------------|
| ۱۰- ابن سید الناس       | عیون الاثر فی فنون<br>المغازی والسير | مصر (ت ن)                                              |
| ۱۱- ابن منظور افریقی    | لسان العرب                           | بولاق، مصر ۱۳۰۷ھ                                       |
| ۱۲- احمد ابن حنبل، امام | مسند                                 | دار المعارف، مصر ۱۹۲۹ء                                 |
| ۱۳- الدینوری، ابن قتیبہ | المعارف                              | قدیمی کتب خانہ، کراچی (ت ن)                            |
| ۱۴- الزبیدی، سید محمد   | تاج العروس من<br>جواہر القاموس       | مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ                                 |
| ۱۵- بخاری، امام محمد    | الجامع الصحیح                        | دارالکتب العلمیہ، بیروت،<br>لبنان                      |
| ۱۶- بغدادی، ابن خطیب    | تاریخ بغداد                          | قاہرہ، ۱۹۳۱ء                                           |
| ۱۷- بغدادی، محمد ابن    | کتاب المحرم                          | دارہ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد<br>دکن، ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء |
| ۱۸- بغدادی، محمد ابن    | کتاب المنمق                          |                                                        |
| ۱۹- بلاذری، احمد بن     | فتوح البلدان                         | دارالکتب العلمیہ، بیروت<br>۱۳۰۳ھ / ۱۹۸۳ء               |
| ۲۰- بلاذری              | انساب الاشراف                        | یروشلم ۱۹۳۶ء                                           |
| ۲۱- ذہبی، شمس الدین     | سیر اعلام النبلاء                    | موسسة الرسالة، بیروت<br>۱۳۰۶ء                          |
| ۲۲- طبری، ابو جعفر محمد | تاریخ الرسل و<br>الملوک              | دارالمعارف، مصر ۱۹۶۱-۹ء                                |

- ۲۳- مصری، احمد امین فجر اسلام  
لجنة التالیف والترجمہ والنشر،  
قاہرہ ۱۹۶۵ء
- ۲۴- واقدی، محمد بن عمر کتاب المغازی  
(مرتب ہے۔ ایم۔ بی۔ جونز)  
آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۹۶۳ء
- ۲۵- یاقوت حموی معجم البلدان  
دار احیاء التراث العربی، بیروت  
۱۹۷۹ء
- اردو کتب:
- ۲۶- احسان الحق اردو عربی کے لسانی  
رشتے  
قرطاس، کراچی ۲۰۰۵ء
- ۲۷- جواد علی تاریخ طبری کے ماخذ  
(مترجم نثار احمد فاروقی) دوست  
ایسوسی ایٹ، لاہور ۱۹۹۸ء
- ۲۸- خالد، انور محمود اردو نثر میں سیرت  
رسول  
اقبال اکادمی پاکستان، لاہور  
۱۹۸۹ء
- ۲۹- خان، صولت علی اسلام اور مسلمان  
۳۰- خورشید احمد اسلامی نظریہ حیات  
شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ،  
کراچی یونیورسٹی، کراچی  
۱۹۶۸ء
- ۳۱- دانا پوری، حکیم اصح السیر  
عبدالروف  
اصح المطابع، کراچی

- ۳۲- ذہبی، امام ابو عبد اللہ محمد تذکرۃ الحفاظ  
(مترجم محمد اسحاق) اسلامک  
پبلشنگ، لاہور، ۱۹۸۱ء
- ۳۳- سیوطی، جلال الدین تاریخ الخلفاء  
(مترجم شبیر احمد انصاری) مکہ  
پبلشنگ کمپنی، لاہور
- ۳۴- سیوہاروی، حفظ الرحمن قصص القرآن  
لاہور
- ۳۵- شبلی نعمانی سیرۃ النبی  
اعظم گڑھ
- ۳۶- صدیقی، علی محسن مقدمات تاریخی  
قرطاس، کراچی ۱۹۹۹ء
- ۳۷- ظہیر، نگار سجاد عرب اور موالی  
قرطاس، کراچی ۲۰۰۵ء
- ۳۸- عبدالمعبود، محمد تاریخ مدینہ منورہ  
مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- ۳۹- عروہ بن زبیر مغازی رسول اللہ  
تحقیق و ترتیب، محمد مصطفیٰ اعظمی (مترجم)  
محمد سعید الرحمن علوی (ادارہ ثقافت  
اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۰ء
- ۴۰- غازی، محمود احمد محاضرات سیرت  
الفیصل، لاہور، ۲۰۰۸ء
- ۴۱- گیلانی، مناظر احسن تدوین قرآن  
مکتبہ اسحاقیہ، کراچی ۱۹۸۶ء
- ۴۲- گیلانی، مناظر احسن تدوین حدیث  
مکتبہ العلم، لاہور (ت ن)
- ۴۳- مصطفیٰ سباعی حدیث رسول کا  
(مترجم غلام احمد حریری)  
تشریحی مقام
- ۴۴- مودودی، سید ابوالاعلیٰ تفہیم القرآن  
ادارہ ترجمان القرآن، لاہور،  
۱۹۹۷
- ۴۵- مودودی، سید ابوالاعلیٰ سیرت سرور عالم  
اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

۳۶- مبارک پوری، قاضی تدوین سیر و مغازی بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۵ء

اطہر

۳۷- محمد کاظم عربی ادب کی تاریخ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،

۲۰۰۳ء

۳۸- ندوی، سید سلیمان تاریخ ارض القرآن مجلس نشریات اسلام، کراچی

۳۹- اردو دائرہ المعارف دانشگاه پنجاب، لاہور ۲۰۰۲ء

الاسلامیہ

### مقالات:

۱- دوری عبدالعزیز، اسلامی تاریخ نگاری میں زہری کا حصہ، مشمولہ نقوش،

رسول نمبر جلد ۹ شماره ۱۳، جنوری ۱۹۸۴، ادارہ فروغ

اردو، لاہور

۲- جوزف ہوردوتس، سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین، مشمولہ

نقوش، رسول نمبر جلد ۱ (شماره ۱۳۰) دسمبر ۱۹۸۲ء ادارہ

فروغ اردو، لاہور

۳- حمید اللہ، محمد سیرت ابن اسحاق (محاکمہ) مشمولہ، نقوش، رسول نمبر

جلد ۱۱، ادارہ فروغ اردو، لاہور

۴- زیبا افتخار امام المغازی، محمد ابن اسحاق، مشمولہ الايام، جلد ۱ شماره ۱،

مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی،

جنوری۔ جون ۲۰۱۰ء

ابن شہاب زہری بہ حیثیت سیرة نگار، مشمولہ الايام، جلد ۱

شماره ۱

۴- زیبا افتخار



- ۶۔ شکیل اوج  
قرآن بطور ماخذ سیرت، مشمولہ الایام، جلد ۱ شماره ۱
- ۷۔ عنایت اللہ شیخ  
رسول اکرم کے سیرت نگار، مشمولہ نقوش سیرت نمبر جلد اول
- ۸۔ فاروقی، ثار احمد  
'طبقات ابن سعد، سیرت نبوی کا قدیم ماخذ' مشمولہ  
نقوش رسول نمبر جلد ۱
- ۹۔ فواد سیزگین  
سیرت نگاران نبوی (مترجم شیخ نذیر حسین) مشمولہ  
ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اگست / ستمبر ۱۹۹۳ء

## ENGLISH BOOKS

1. H.A.R. Gibb "Shorter Encyclopedia of Islam" South Asian Publications, Karachi, 1981.
2. Rozenhal, Franz "A history of Muslim Historiography, (Leiden, 1952).
3. Faruqi, Nisar Ahmad, "Early Muslim Historiography, (Delhi, 1979)
4. G.M. Rasul, "Origin and development of Muslim Historiography, (S.M. Ashraf, Lahore, 1968).
5. Siddiqui, M. Mazharuddin, "The Quranic concept of History, (Islamic Research Institute, Islamabad, (1993).



نگار سجاد ظہیر کے قلم سے

### تاریخ و تحقیق:

○ غلامی ایک تحقیقی جائزہ

○ مطالعہ تہذیب

○ جدید ترکی

○ مختار ثقفی

○ عرب اور موالی

### شعر و ادب:

○ دستِ قاتل (افسانے)

○ بارہستی (افسانے)

○ سوادِ شام سے پہلے (شعری مجموعہ)

### سفر نامہ:

○ دشتِ امکاں (سفر نامہ نجد و حجاز)

6429

ISBN:

978-969-8448-85-1

Rs: 250/- (Hard Binding)

Rs: 220/- (Paper Back)